ابتدائی کلمات

(از شریمان پنڈت پدم سنگھ صاحب شرما پرفیسر گوروکل کانگڑی و پریذیڈنٹ ہندی ساہتیہ سمیلن)

ہندوؤں کی خانہ جنگی کے بعد بھارت میں مسلمانوں کی حکمرانی کا دور جاری ہوا۔ اس وقت سے یہاں جہاد اور تبلیغ کے ذریعہ اشاعت اسلام کا کام بھی برابر جاری ہے ترغیب۔ تحریص۔ خوف اور لالچ میں آکر کروڑوں ہندو اپنے پوتر دھرم سے پتت ہو کر اسلام کے بندے بن گئے۔ جب تک اسلامی حکومت رہی۔ جہاد اور جزیہ کو اشاعت اسلام کا آلہ بنایا گیا۔ بعد کو تقریر اور تحریر سے کام لیا گیا۔ ہندو قوم کچھ تو صدیوں کی مسلسل مصیبتوں سے اور کچھ اپنی عادت سے لاچار ہو کر ان مذہبی حملوں کو بے حسی سے برداشت کرتی رہی۔ مہرشی دیانند کے ظہور نے ہندوؤں کی آنکھیں کھولیں۔ مہرشی نے غیر مذہب کے جابروں کا تختہ مشق بنی ہوئی قوم سے للکار کر پوچھا۔

قوم اے پیکر بے حس ترے پتھر دل میں
قطرۂ خوں نہ سہی کوئی شرر ہے کہ نہیں

مہرشی کے سنگھ ناد کو سن کر مخالفوں سے لوہا منوانے کے لئے سیف قلم ہاتھ میں لئے ہوئے جو بہادر سب سے پہلے میدان میں اترا۔ وہ شریمان منشی اندرامن صاحب مرادآبادی ہیں۔ اس وقت ایک نو مسلم عبداللہ نامی نے (جو پنت ضلع مظفر نگر کا باشندہ ایک کھتری تھا) ہندوؤں کے خلاف ایک طوفان بد تمیزی برپا کر رکھا تھا۔ ہندوؤں کے خلاف درجنوں کتابیں نہایت دل آزار نظم و نثر میں یہ شخص لکھ چکا تھا۔ منشی اندرمن جی نے اس کی ایک ایک تصنیف کا دندان شکن جواب دے کر اسے لاجواب

کر دیا۔ منشی اندرمن جی عربی فارسی کے بڑے زبردست عالم اور اہل قلم تھے۔ اسلامی لٹریچر پر اُنہیں عبور حاصل تھا۔ میاں عبداللہ اور دوسرے مُلانوں سے جب منشی جی کی کتابوں کا کچھ جواب نہ بن پڑا۔ تو "کھسیانی بلی کھمبے نوچے" کے مصداق منشی جی کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ مقدمہ [illegible] کیا گیا۔ نچلی عدالت میں اپنی حکمت عملیوں سے مخالف کامیاب ہو کر بغلیں بجانے لگے۔ مہرشی دیانند نے منشی جی کی امداد کے لئے پبلک اپیل کر کے مقدمہ کا ہائیکورٹ میں اپیل دائر کرا دیا۔ جہاں سے منشی جی تمام الزامات سے بری کئے گئے۔ جرمانہ معاف ہو گیا۔ اور کتابوں کی ضبطی کا حکم واپس لے لیا گیا۔ منشی جی کی وفات کے بعد اُن کی کتابیں نایاب ہو گئیں۔ لیکن وہ اپنا کام کر گئیں۔ ہندوؤں کو بیدار اور مخالفین کو خبردار بنا گئیں۔ یعنی اُنہیں معلوم ہو گیا۔ کہ وہ کتنے پانی میں ہیں ؟

اس کے کچھ عرصہ بعد مرزا غلام احمد قادیانی نے ہندو دھرم پر اور خاصکر آریہ سماج پر از سر نو حملے شروع کئے۔ قادیانی صاحب کے حملوں کا جواب باصواب شری پنڈت لیکھرام جی آریہ مسافر نے دیا۔ اور ویسا دیا کہ باید و شاید۔ مرزا صاحب سے جب کچھ جواب نہ بن پڑا۔ تو آریہ مسافر کے قتل کی پیشگوئی کی گئی اور بلاشبہ اس میں اُنہیں کسی طرح کامیابی ہو گئی۔ یعنی آریہ مسافر شہید کر دیئے گئے۔ پنڈت لیکھرام جی مرتے مرتے وصیت کر گئے۔ کہ آریہ سماج سے تحریر کا کام بند نہ ہونا چاہیئے۔ اس وصیت کی تکمیل کیلئے "آریہ مسافر میگزین" جاری کیا گیا۔ لالہ وزیر چند جی ودیارتھی کے اہتمام سے کئی سال تک بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا۔ آریہ مسافر کی وصیت کو پورا کرنے کے لئے پنڈت بھوجدت جی نے بھی کام کیا اور اچھا کیا۔ آریہ سماج نے مخالفین پر حملہ کرنے میں کبھی پیشقدمی نہیں کی۔ جب جو کچھ بھی کیا۔ حفاظت خود اختیاری سے مجبور ہو کر کیا۔ لیکن مشہور یہ ہمیشہ یہ کیا گیا کہ آریہ سماج دوسرے مذاہب پر خواہ مخواہ بلاوجہ سخت

حملہ کرتا ہے - کیسا فضول الزام ہے -

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

بارے مہر خاموشی ٹوٹی - آریہ پبلک کو شریمان پنڈت چموپتی جی کا مشکور ہونا چاہیے کہ انہوں نے "جواہر جاوید" جیسی محققانہ اور عالمانہ تصنیف کے ذریعہ ثابت کر دیا - کہ

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

پنڈت لیکھرام جی کے بعد اس شان کی یہ ایک ہی کتاب نکلی ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے - آریہ سماج کے لٹریچر میں بلاشبہ یہ ایک قابل قدر اضافہ ہے -

ستیارتھ پرکاش کے چودہویں سملاس کے خلاف جس قدر طوفان گذشتہ کئی سال سے جاری ہے - وہ عوام کی نظروں سے مخفی نہیں - اس بارہ میں آریہ سماج کی طرف سے جواب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی - خاموشی سے غلط فہمی پھیل رہی تھی - کچھ لوگوں کا خیال ہو چلا تھا - کہ چونکہ مہرشی دیانند عربی و فارسی کے عالم نہ تھے - اس لئے ممکن ہے قرآن مجید پر انہوں نے سنے سنائے اعتراضات جڑ دیئے ہوں - اگرچہ جاننے والے جانتے تھے کہ جس وقت مہرشی نے ستیارتھ پرکاش لکھا ہے منشی اندرمن اور پنڈت امرادسنگھ جیسے عربی و فارسی کے جید عالم اُن کے حلقہ شاگردی میں آچکے تھے - ایسے باخبر مریدوں کی موجودگی میں یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مہرشی سا محقق بلا کامل اطمینان کے یونہی اعتراضات کر دیتا - شکر ہے - کہ پنڈت چموپتی جی نے قرآن مجید کے متعلق مہرشی کے اعتراضات کو کما حقہ حق بجانب ثابت کر دیا ہے - پنڈت جی کے چودہویں کے چاند کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے - " ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند "

" چودہویں کا چاند" شروع سے آخر تک میں نے خود مصنف سے سنا ہے اور

خوب تنقیدانہ غور سے سُنا ہے - میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں - کہ کتاب
نہایت عالمانہ محققانہ - مدلل اور مہذبانہ پیرایہ میں لکھی گئی ہے - حق پرکاش جیسی گھناونی
کتاب کے جواب میں لائق مصنف نے متانت اور سنجیدگی کو جواب نہیں دیا - ایسے مواقع
پر سچ مچ بڑے ضبط سے کام لیا ہے - جو قابل تحسین ہے -

کتاب کے ہر صفحہ سے اسبات کا ثبوت ملتا ہے کہ مصنف نے نہایت جانفشانی
سے تحقیقات کی ہے - ہر بات کے لیے قرآن و تفاسیر سے ثبوت بہم پہنچائے گئے
ہیں - کتاب میں ایک بات بھی دعویٰ بےدلیل کے طور پر نہیں لکھا گیا - عبارت دلچسپ
اور فلسفیانہ ہے - طرز تحریر دلکش اور پاکیزہ ہے - پڑھنے اور سننے میں لطف آتا ہے
بلا ختم کیے کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا -

مہرشی نے قرآن کی جس اردو شرح سے اپنی کتاب میں حوالے دئیے ہیں - پنڈت
چموپتی جی نے اس شرح سے جا بجا عبارت نقل کرکے مہرشی کے اعتراضات کی
صداقت پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے -

اس چودھویں کے چاند کی روشنی میں مذہب اسلام کے تمام مسلمات
اور اعتقادات کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے - کوئی خاص اور اہم اصول
باقی نہیں رہا جس پر اس میں مدلل اور مفصل بحث نہ کی گئی ہو - غرضیکہ
"چودھویں کا چاند" ایک ایسی کتاب ہے - جس کی ایک مدت سے ضرورت
محسوس ہو رہی تھی - اور ہر ایک متلاشی حق پر اس کا پڑھنا لازم ہے -

دیباچہ

گذشتہ صدی میں جتنی کتابیں مذاہب کی دُنیا میں لکھی گئی ہیں۔
ان میں ستیارتھ پرکاش کو ایک خاص امتیازی درجہ حاصل ہے۔ اس
کی بدولت اہلِ مذاہب کے خیال میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہوا ہے
جن مذاہب کی بنیاد فقط نقل پر تھی۔ اُنہوں نے عقل کو نقل کا رفیق۔
ہم خیال۔ مونس بنا لیا ہے۔ اور جو لوگ فقط عقل کے پیرو تھے۔ اُنہوں
نے پُرانی اقوام کے منقولہ صحیفوں میں کسی اعلیٰ عقل کی جلوہ گری دیکھ
لی ہے۔ تاریخی مذاہب کا راگ اپنے سے سابقہ مذاہب کی تنسیخ اور
ایک نئی زمانہ کی ضرورت کے مطابق عمارت کی تعمیر تھا۔ تماشا یہ تھا۔
کہ ہر نیا مذہب یہ دعویٰ بھی ساتھ ہی کرتا تھا۔ کہ میرے بعد اور سب
دعوے سُننے سے بھی پہلے خارج سمجھے جائیں گے۔ پُرانوں کو نیوں سے
شکایت تھی۔ کہ انہوں نے ہماری صدیوں کی کامیاب مجلسی اور مذہبی
مساعی پر پانی پھیر دیا ہے۔ ہم نے اُن کے لئے سفر مینا کا کام کیا۔ اب
یہ ہمیں چُپکے سے زندگی بسر کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ نئے پرانوں
سے نالاں تھے۔ کہ یہ بوسیدہ اعتقادوں کے ٹھیکیدار خود اصلاح
قبول کرنے سے تو رہے۔ اپنے کہنہ دقیانوسی وجود کی بدولت نئی نسلوں
کو بھی نئے سانچے میں ڈھلنے سے باز رکھتے ہیں۔ دونو اپنے اپنے ایشور
کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ اور فریقِ مخالف کے لئے من مانی لعنتیں

حاصل کر رہے تھے۔ رشی نے اپنے زبردست استدلال سے جس کا منبع
رشی کا روحانی کشف تھا۔ اس خیال کی رَو کو ہی بدل دیا۔ اگر منقول معقول
کا ماوا و ملجا ہے۔ تو یہ منقول جتنا پرانا ہو گا۔ اتنا زیادہ قابل تعظیم ہو گا۔
اور اگر یہ ہر منقول اپنے زمانہ کی ہی ہدایت کا کام کرتا ہے۔ تو نیا منقول
بھی اپنے ہی زمانے کی ضرورتیں پوری کرے گا۔ اور اس کے بعد اس
کے نسخ کی ضرورت رہیگی۔ اپنے پیشرو منقول کے ناسخ بھی بنو۔ اور آگے
خود نسخ کے زیر اثر نہ آؤ۔ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہ ہونگی۔ آج کا
ناسخ دین کل کا منسوخ دین بننا لازم ہے۔ جسے منسوخ نہ ہونا ہو۔ اُسے
ناسخ بننے سے پہلے سے ہی گریز کرنا چاہیئے۔

الہامی مذاہب کا کام منقول کے سوا چل ہی نہیں سکتا۔ انہیں تسلیم کرنا
ہوتا ہے۔ کہ ازل سے یا ابتدائے آفرینش سے پرماتما اپنے علم کی تجلیاں
اپنے پیاروں کے دلوں میں ڈالتا رہا ہے۔ انہیں تجلّیات کا عکس انسانی
علوم کی صورت اختیار کرتا ہے۔ انسانوں نے پرماتما کے وحی کئے اصولوں
کو اپنے مکانی اور زمانی دستور العمل کی صورت دے دی ہے۔ آریہ علم
ادب میں پرماتما کی ازلی وحی کا نام شرتی۔ اور انسانی دستور العمل کا نام
سمرتی ہے۔ قرآن میں شرتی کو ام الکتاب اور سمرتی کو محض کتاب کا
نام دیا ہے۔ رشی ان منقولوں کے سلسلے کو وید تک لے گئے ہیں۔
زمانہ حال تک کی ادبی تفتیش اس صداقت کی معترف ہے۔ کہ بنی نوع
انسان کے کتب خانے میں وید سب سے پرانی کتاب ہے۔ اس کتاب
کو ام الکتاب۔ جسے اتھرو وید میں وید ماتا کہا ہے۔ کہنا کس قدر موزوں
ہے! قرآن میں حضرت آدم کو الہام ملنے کا ذکر ہے۔ اور وہاں کہا ہے

عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا

اور سکھائے آدم کو نام سب چیزوں کے

یعنی تمام علوم ابتدائے آفرینش میں انسان کو دے دئے گئے۔ جن لوگوں کا اِس پُرانے الہام پر اعتبار ہے۔ وہ گویا الہام کی قدیم روایت کے سب سے پہلے محافظ ہیں۔ اس کامل علم کے نسخ کی کوئی معقول ضرورت انسانی قیاس سے باہر ہے۔ الہام کا رُوحانی کمال توحید الٰہی کا مسلمہ ہے۔ اور یہ جیساکہ ہم نزول قرآن کے باب میں خود قرآن کے حوالہ سے ثابت کریں گے۔ ہر پیغمبر کے الہام کی جان رہا ہے۔ جو لوگ الہام کی ضرورت فقط علم الٰہیات کا کشف سمجھتے ہیں۔ اُن کے لئے پہلا الہام ہی آخری الہام ہونا چاہیئے۔

الہام کے نسخ کا عقیدہ جہاں پر ماتما کے علمی کمال میں نقص کے امکان کا خدشہ پیدا کرتے ہیں۔ وہاں مجلسی اور قومی تنازعات کی بھی بنیاد ڈالتا ہے قرآن اس صداقت کا قائل ہے۔ چنانچہ کہا ہے۔

وما کان الناس الا امت واحدہ فاختلفو

اور لوگ جو ہیں سو ایک ہی اُمت تھے پیچھے جدا ہوئے

بعد کے ہر الہام سے ایک مِلّت کے دو ٹکڑے ہو جانے لازم ہیں۔ ایک اِس الہام کے قبول کرنے والے۔ دوسرے اسے بدعت سمجھ کر اسے دُور سے سلام کر دینے والے۔ مذاہب کے بانیوں کی اس دانائی کی داد دینی چاہیئے۔ کہ اُنھوں نے ہمیشہ سابقہ دین کو تازہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ اسے تلف کرنے کے مدعی نہیں ہوئے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ متذکرہ دو جماعات میں عناد اور مخاصمت کا رشتہ پیدا ہو جاتا رہا ہے

اگر مُصلح اِصلاح ہی کرنا چاہتے ہیں۔ تو اُنہیں اس اصلاح کو جبراً قبول کرانے سے مطلب ؟ اور اگر قدامت پسند ان اصلاح پسندوں کے بزرگ ہی ہونے کے مُدعی ہیں۔ تو اُنہیں اصلاح کا گلا گھونٹنے سے سروکار ؟ غلطی اُس وقت ہوتی ہے۔ جب جدّت دوست قدامت کی راہ کو سراسر باطل کہنے لگتے ہیں۔ اور قدامت کے پرستار نئی پیڑھی کی تجدید کو سرتاپا فریب کا خطاب دیتے ہیں۔ اسی لئے رشی دیانند فرماتے ہیں :-

جو دُوسرے مذہبوں کو جن کے ہزاروں کروڑوں آدمی معتقد ہوں جھوٹا بتائے۔ اور اپنے کو سچا ظاہر کرے۔ اُس سے بڑھ کر جھوٹا اور مذہب کون ہو سکتا ہے ؟

(ستیارتھ پرکاش - چودھواں سملاس)

ایک اور جگہ لکھا ہے :-

مَیں پُران - جینیوں کی کتابوں - بائیبل اور قرآن کو پہلے ہی سے بُری نظر سے نہ دیکھ کر ان کی خوبی کو تسلیم اور نقصوں کو ترک کرتا ہوں۔

(دیباچہ ستیارتھ پرکاش)

فی الحقیقت سچائی کسی مذہب میں ہو۔ وہ ہر مذہب اور فرقے کی مشترکہ ملکیت ہے۔ رشی دیانند کا قول زرّین حروف میں لکھنے کے قابل ہیں :-

میرا کسی نئے خیال یا مت کو جاری کرنے کا ذرا بھی منشا نہیں ہے۔ بلکہ جو سچ ہے اس کو ماننا منوانا اور جو جھوٹ ہے۔ اُس کو چھوڑنا چھُڑانا مدنظر ہے :-

(دیباچہ مسلمات غیر مسلمات)

اس مشترکہ سچائی کا مخزن اور منبع وید ہیں۔ وقتاً فوقتاً مذہبی ڈھانچے کی تجدید کی ضرورت رہتی ہے۔ ہر پُرانی رسم وقت پاکر بے جان ہو جاتی ہے۔ نیا رشی یا ملہم شخص آتا ہے۔ اور پرانی" زمانے کی وجہ سے بوسیدہ ہو گئی۔ ہڈیوں میں نئی جان پھونکتا ہے۔ اسے آریہ علم ادب میں سمرتی کہتے ہیں۔ سمرتی کا اطلاق کسی خاص ملک پر کسی خاص زمانے کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ ستیارتھ پرکاش اسی قسم کا سمرتی گرنتھ ہے۔ سمرتی اپنے زمانے میں کام کر جاتی ہے۔ اور اس کے بعد نئے رشی اس کی جگہ نئی سمرتی وضع کرتے ہیں۔ جہاں شرتی پرماتما کی طرف سے اور کامل ہوتی ہے۔ وہاں سمرتی انسان کی وہ تصنیف ہوتی ہے۔ جس میں پرماتما کی ہدایت بطور بنیادی اصول کے کام کرتی ہے۔ شرتی ام الکتاب ہے اور وہ لوحِ محفوظ میں ہے۔ یعنی اسے منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سمرتی فقط کتاب ہے۔ وہ بقول :-

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ (سورہ بنی اسرائیل ع ۹)

اور اگر ہم چاہیں لے جائیں وہ چیز جو وحی کی ہے ہم نے طرف تیرے

منسوخ کی جا سکتی ہے۔

کیسا سنہری قاعدہ ہے! مذاہب میں اختلاف ہے۔ اور کچھ حصوں میں اتفاق بھی ہے۔ اب یہ اختلاف اور اتفاق دونوں پرماتما کی طرف سے نہیں ہو سکتے۔ متفق علیہ حصے ہی پرماتما کی طرف سے ہو سکتے ہیں۔ ان کی تعظیم کرو۔ باقی کی کھلی تردید۔

یہی طریق کار رشی دیانند نے اختیار کیا۔ ستیارتھ پرکاش کے پہلے دس سملاسوں میں سچ کی تائید کی۔ یہ سچ سب کا مشترک ہے۔ آخری چار

سملاسوں میں مذاہب کے مختلف فیہ حصوں کی تنقید کی ہے - گیارہویں سملاس میں پران - بارہویں سملاس میں چارواک - بودھوں کے عقائد - تیرھویں میں عیسائیت - اور چودھویں میں اہلِ قرآن کے عقائد پر محققانہ نظر ڈالی ہے - یہ تنقیدی باب کتاب کے آخر میں آتے ہیں - کیونکہ

جب تک آدمی جھوٹ سچ سمجھنے کی استعداد نہیں بڑھاتے - تب تک موٹے اور باریک نکات تردید کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے -

(ستیارتھ پرکاش - خاتمہ حصہ اوّل)

اِس تنقید کے دوران میں بھی جا بجا مذہب زیرِ تنقید کی خوبیوں کا اعتراف کرتے گئے ہیں - چنانچہ چودھویں سملاس میں قرآن کی اِس ہدایت پر کہ ماں باپ کی خدمت اور اطاعت کرنی چاہیئے - سوائے اس امر کے کہ وہ شرک کی تعلیم دیں - فرمایا ہے -

ماں باپ کی خدمت کرنا تو اچھا ہی ہے - اگر خدا کے ساتھ شریک کرنے کے لئے وہ کہیں - تو ان کا کہنا نہ ماننا - یہ بھی ٹھیک ہے - (فقرہ ۱۲۲)

حائضہ کے نہ چھُونے پر فرمایا ہے -

یہ جو حائضہ کو نہ چھُونا لکھا ہے - یہ اچھی بات ہے - (فقرہ ۸۸)

یہ تمام تنقید کس مطلب سے کی گئی ہے ؟ اس کا اظہار رشی نے اپنے قلم اعجاز رقم سے یوں فرمایا ہے -

جو مختلف مذاہب کے آپس میں مخالفانہ جھگڑے ہیں - ان کو میں پسند نہیں کرتا - کیونکہ انہی مت والوں نے اپنے متوں کی اشاعت کر کے اور لوگوں کو ان میں پھنسا کر ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے - اس بات کی تردید سے اور کامل سچائی کی اشاعت سے سب کو طریق یگانگت

پرلاکر۔ دشمنی چھڑا کر۔ آپس میں مستحکم محبت کا رشتہ قائم کر کے سب
سے سب کو آرام پہنچانے کے لئے میری کوشش اور میرا مدعا ہے ۔

(ستیارتھ پرکاش۔ خاتمہ)

دنیا میں راستی اور ناراستی ۔ حق و باطل ۔ نیک و بد دونوں موجود ہیں۔
جہاں راستی ۔ حق ۔ نیکی کا اختیار کرنا انسان کا فرض ہے ۔ وہاں ناراستی
باطل ۔ بدی سے بچنا اور اہل عالم کو بچانا بھی اتنا ہی لازم فرض ہے ۔ رشی
دیانند چودھویں سملاس کے آخر میں فرماتے ہیں ۔

ایسے ہی اپنے اپنے مذہب کے متعلق سب کہتے ہیں ۔ کہ ہمارا ہی مذہب
اچھا ہے ۔ باقی سب برے ۔ ہمارے مذہب کے سوا دوسرے مذہب
سے نجات نہیں ہوسکتی ... . ہم تو یہی مانتے ہیں ۔ کہ راست
گفتاری ۔ کسی کو ایذا نہ دینا ۔ رحم وغیرہ عمدہ اوصاف سب مذاہب میں اچھے
ہیں ۔ اور باقی جھگڑا بکھیڑا ۔ حسد ۔ نفرت ۔ دروغ گوئی وغیرہ افعال سب
مذاہب میں خراب ہیں ۔ اگر تم کو سچا دھرم قبول کرنے کی خواہش ہو ۔ تو
ویدک دھرم کو قبول کرو ۔

(ستیارتھ پرکاش ۔ خاتمہ چودھواں سملاس)

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ۔ کہ مذہب کا ایک تو باطن یا روح ہے ۔ وہ عالمگیر
سچائیاں ہیں ۔ جو ہر وقت اور ہر جگہ یکساں صحیح رہتی ہیں ۔ ان کے علاوہ
مذہب کا بیرونی جسم ہوتا ہے ۔ جو مکانی اور زمانی ضروریات کے اقتضاء
سے بنا ہے ۔ مثلاً ہر مذہب کی مجلسی مراسم ۔ وضو اور سنان کے طریقے
آداب واطوار ۔ حج اور یاترا ۔ زکواۃ یا دان کی مقدار ۔ روزے اور
برت کے قواعد ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ جہاں مذہب کا مقدم الذکر پہلو انسانوں

کی مختلف اقوام کو باوجود مکانی اور زمانی اختلافات کے ایک بناتا ہے۔
وہاں مؤخر الذکر حصہ واحد ملت انسان کو ان کے زمانی اور مکانی حالات
کے مطابق جدا جدا حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ جو مذہب کسی خاص زمانے
میں آیا ہو۔ اسے مذہب کے دوسرے حصے کی ایک صورت تصور کرنا
چاہیئے۔ مثلاً قرآن شریف اپنے متعلق خود فرماتا ہے۔

لِتُنْذِرَ اُم القریٰ ومن حولھا

کہ تو ڈرا دے اہل مکہ اور آس پاس کے لوگوں کو۔

پھر کہا ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا (حج - رکوع ۵)

واسطے ہر اُمت کے بنائی طرح عبادت کی۔

یہی حال ہندوستان کی سمرتیوں۔ پرانوں اور دیگر تاریخی مذاہب کے
صحیفوں کا ہے۔ ان کی صداقت ان عالمگیر ہدایتوں کی وجہ سے ہے۔ جو
تمام مذاہب کی جان ہیں۔ وہ ام الکتاب کے ارشادات ہیں۔ وہ زمان
ومکان کی حدود سے بالاتر ہیں۔ انہیں مٹایا نہیں جا سکتا۔ وہ لوح محفوظ
پر ثبت ہیں۔

جب تک مذہب پرماتما کے پیاروں کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ وہ
اسی ازلی اور ابدی دھرم پر اپنا تمام تر زور صرف کرتے ہیں۔ وہ آداب
واطوار۔ قواعد وضوابط پر زور دیتے ہیں سہی۔ کیونکہ روح کا قیام بغیر جسم
کے اس عالم ترکیب وتشکیل میں مشکل ہے۔ لیکن انہیں وہ آلہ کار
سمجھتے ہیں۔ نہ کہ مقصد کار۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان کے ارشادات بعض اوقات
ایک دوسرے کو منسوخ بھی کر جاتے ہیں۔

اسی اصول کو مدنظر رکھ کر قرآن میں کہا ہے۔

مَا نَنسَخْ مِنْ اٰیَاتِہٖ اَوْ نُنسِہَا نَاتِ بِخَیْرٍ مِّنْہَا اَوْ مِثْلِہَا

جو منسوخ کرتے ہیں آیات میں سے یا بھلا دیتے ہیں۔ لاتے ہیں بہتر اس سے یا مانند اس کے۔

آفت تب آتی ہے۔ جب مذہب اپنے بانی کے ہاتھ سے نکل کر مقلدوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ یہ لوگ مذہب کے بیرونی ڈھانچے کو ہی جس کا نام وہ شرع رکھتے ہیں۔ مذہب کی جان سمجھ لیتے ہیں۔ ان کی نظر مذاہب کی عالمگیر تعلیمات پر نہیں پڑتی۔ ان کا دھیان ظاہری ضوابط کی پابندی ہی پر رہ جاتا ہے۔ وہ مذہب کی پولیس ہیں۔ جو قانون کے حقیقی منشا سے واقف نہیں۔ انہیں تو دھر پکڑ کے لئے موقعہ چاہئے۔ کفر کے فتوے ان سے جتنے چاہو۔ لکھوا لو۔ شروع شروع میں یہ فتوے لکھے نیک نیتی سے جاتے ہیں۔ مذہب کی غلط تعبیر کرنے میں قصور مفتی کے دل کا نہیں۔ دماغ کا ہوتا ہے۔ اس کا ارادہ بے لوث ہوتا ہے۔ مگر تنگ نظری، حق جوئی اور حق شناسی سے مانع ہوتی ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا ہے۔ مذہب کے میدان میں لالچ۔ ظلم۔ غرور وغیرہ شہوانی جذبات دخل پا جاتے ہیں۔ اور مذہب کو ایجنٹ یا وکیل کا دفتر بنا چھوڑتے ہیں۔

رشی دیانند مذہب کے اس رنگ کو مت کہتے ہیں۔ مذاہب کے شہوانی غلاف کی رشی نے سخت تردید کی ہے۔ رشی کا تمام تر زور وید کی عالمگیر تعلیمات پر ہے۔ ان تعلیمات کو ہندوستان میں قابل عمل در آمد بنانے اور بنائے رکھنے کی غرض سے رشی نے انہیں ستیارتھ پرکاش۔ سنسکار ودھی وغیرہ کتب میں شریعت کا جسم عطا کیا ہے۔ یہ شریعت

دیگر ممالک میں جا کر کہیں کہیں تبدیل ہو جائے۔ تو کچھ تعجب نہیں۔ رشی کے نزدیک وید کی غیبت کرنے والا ناستک ہے۔ لیکن اس ناستک کے لئے بھی نہ کہیں جہنم تجویز کیا ہے۔ نہ پرماتما کی رحمت کا دروازہ اس پر ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے۔ رشی نے ایک نہایت معقول اصول وضع کیا ہے۔ جو حق پسندوں کو لوحِ دل پر نقش کرنا چاہیئے۔ مدعیانِ مذاہب کی بیہودہ جنگ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

اپنے اپنے قول کے مطابق دونوں (پُرانی اور قرآنی) جنتی اور دوسرے کے قول کے مطابق دونوں جہنمی ہیں۔ اس لئے ان سب کا جھگڑا جھوٹا ہے۔ مگر جو دھارمک (نیک) ہیں۔ وہ سُکھ اور جو پاپی ہیں۔ وہ تمام مذاہب میں دُکھ پائیں گے۔

(ستیارتھ پرکاش۔ چودھواں سملاس)

وید کے متن پر ایمان لانے اور ان ہدایات کا مطلب سمجھنے کا اپنا ثواب ہے۔ لیکن زبانی ایمان اور علم کے علاوہ ان احکام کی عملی پیروی بذاتِ خود ایک نہایت عظیم الشان ثواب ہے۔ جس کا اجر پرماتما کی طرف سے سُکھ اور برکت کی شکل میں ملتا ہے۔ اور زبانی اور ذہنی اعتقاد کے ہوتے ہوئے بھی اگر عمل ان احکام کے برخلاف رہے۔ تو اُس کی سزا دُکھ ہے۔

اختلاف اعتقاد کی سزا ہر فرقہ دار جہنم تجویز کرتا ہے۔ اور جہنمی ایک گالی ہے۔ جو مذاہب کی دُنیا میں دلی نفرت کی لفظی تصویر ہے۔ مولانا محمد علی مہاتما گاندھی کے اخلاق کو اپنے مرشد اور والدہ محترمہ کے اخلاق سے بہتر اور احسن تسلیم کرتے ہیں۔ مگر چونکہ مہاتما گاندھی کلمہ گو نہیں۔ اِس

لئے ان کا مقام جہنم ہی میں قرار دیتے ہیں - یہ غایت درجہ تعصب ہے۔ جس کے مرتکب ہر مذہب کے شرعی ماننے ہوتے ہیں - رشی نے ایک تو جہنم کے اعتقاد کو ہی مذہب سے ہٹا دیا ہے - پھر لفظی اور ذہنی ایمان کو نہ دھرم کا مترادف قرار دیا ہے - اور نہ اس کا غالب حصّہ ہی تسلیم کیا ہے - سُکھ اور دُکھ اسی عالم میں میسّر ہوتے ہی رہتے ہیں - یہی جنّت اور جہنم ہیں - اس جہنم میں پڑا کوئی انسان نفرت کا مستحق نہیں - اُلٹا ہمدردی کا مستوجب ہے - اس ایک تبدیلی سے اہلِ مذاہب کے باہمی تنازعات کے نیچے سے اس کی بنیاد ہی کھسک گئی ہے - پھر اس سُکھ اور دُکھ کا موجب ہمارے اعمال ہیں - جو ذہنی - زبانی - اور جسمانی تینوں صورتوں میں اختیار کرتے ہیں - ان سب میں اصلاح کرنا ہر بشر کا فرض ہے - رُوحانی ترقی کا جس کی ابتدا تہذیبِ اخلاق سے ہوتی ہے - آخری درجہ نجات پا سکتی ہے جو کسی سفارش سے نہیں - اپنی سعی اور اس میں شامل پرماتما کی رحمت سے ہوتی ہے - اس عقیدے کے ہوتے مخاصمت کے لئے گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے ؟

رشی دیانند محبت کا پُتلا تھا - وہ
سب کو طریقِ یگانگت پر لا کر - دُشمنی چھُڑا کر - آپس میں مستحکم محبت
(کا رشتہ) قائم کر کے سب سے سب کو آرام پہنچانے کا

خواہشمند تھا - لیکن لوگ ہیں - کہ رشی کے مدعا کو سمجھ نہ سکے - اور مان بیٹھے - کہ ستیارتھ پرکاش کے تنقیدی بابوں سے مخاصمت بڑھتی ہے ڈاکٹر کی جراحی کا مدعا مریض کی صحت ہے - مگر مریض کی جہالت اسے خونِ ناحق کا اقدام سمجھتی ہے - پرماتما آریوں - اناریوں دونوں کو

مخاصمت کے جذبۂ حیوانی سے بچائے۔
کتاب ہذا ستیارتھ پرکاش کے چودھویں سملاس کی گویا تمہید ہے۔ ہمارا ارادہ پہلے اس سملاس کی تفسیر لکھنے کا تھا۔ لیکن اس کے لئے بہت وقت اور محنت درکار ہے۔ یہ سملاس ستیارتھ پرکاش کا آخری باب ہے۔ مصنف واجب طور پر امید کرتا ہے۔ کہ اِس باب پر پہنچنے تک ناظر مصنف کے اعتقادات۔ طرز تحریر۔ طریق استدلال۔ پیرایہ تردید و تائید وغیرہ وغیرہ سب امور سے بخوبی واقف ہوگا۔ اِس لئے اپنی تنقید کے اس حصّے میں جائز اختصار سے کام لیتا ہے۔ جہاں دوسری جگہ دو دو اور چار چار فقروں میں اپنا مفہوم سمجھاتا۔ وہاں اس باب میں ایک ہی فقرہ یا اس کا بھی کوئی جزو کافی سمجھتا ہے۔ ہم نے اس باب کا مقابلہ جہاں قرآن شریف اور اس کے ترجموں سے کیا۔ وہاں چند تفاسیر بھی ساتھ ساتھ پڑھتے گئے۔ ہماری حیرانی کی حد نہ رہی۔ جب ہم نے دیکھا۔ کہ رشی کی تنقید قرآن کے الفاظ کے سطحی مفاہیم تک ہی نہیں رہ جاتی۔ بلکہ تفاسیر کے بسیط صفحات میں اُن مطالب و مفاہیم کی نہایت عمیق تہ تک پہنچتی ہے۔ رشی نے ہر سملاس کی طرح اس سملاس کے شروع میں بھی دیباچہ ضمنی لکھا ہے۔ جو لفظ بہ لفظ نیچے نقل کیا جاتا ہے۔ اِس دیباچہ کے پڑھے بغیر سملاس کے صفحات میں داخل ہونے سے رشی کی ذہنیت سے پورا انصاف نہ ہونے کا امکان ہے۔ ناظر کو پہلے ان سطور کا ملاحظہ کرنا چاہیے۔ جن میں رشی کی روح وجد کے انداز میں اپنے اس پاک فرض کا تبصرہ کر رہی ہے۔ جو اپنے وقت کا جگت گورو۔ ورلڈ ٹیچر۔ مرشد عالم ہونے کی حیثیت سے ان کے کرڑے کندھوں

پر پڑا تھا۔ رشی فرماتے ہیں :-

یہ چودھواں سملاس اہلِ اسلام کے عقائد کے بارے میں فقط قرآن کے معانی کو مدنظر رکھ کر لکھا ہے۔ دیگر کتب کے مسلمات کے مطابق نہیں۔ کیونکہ اہل اسلام کا قرآن پر ہی کامل ایمان ہے۔ اگرچہ مختلف فرقوں میں الفاظ کے معانی وغیرہ میں اختلاف ہے۔ تاہم قرآن پر سب متفق ہیں۔ **عربی قرآن کا جو ترجمہ مولوی صاحبان نے اردو میں کیا ہے۔ اُسے دیوناگری حروف اور آریہ بھاشا کا جامہ پہنوا کر عربی کے بڑے بڑے عالموں سے اس کی تصحیح کرا لی گئی ہے۔ اور پھر وہ ترجمہ یہاں درج کیا گیا ہے۔** اگر کوئی کہے۔ کہ یہ معنے ٹھیک نہیں ہیں۔ تو اُسے واجب ہے۔ کہ پہلے مولوی صاحبان کے ترجمے کی تردید کرے۔ بعد ازاں اس مضمون پر قلم اُٹھائیے۔

اس تحریر کا مُدعا انسانوں کی ترقی ہے۔ حق و باطل کی تمیز کے لئے تمام مذاہب کا کچھ کچھ علم ہونا ضروری ہے۔ جس سے باہم مقابلے کا موقعہ ملے۔ اور لوگ ایک دوسرے کے عیوب کی تردید کر کے خوبیوں کو اختیار کریں۔ **ہمیں نہ کسی اور مذہب پر اور نہ اس مذہب پر جھوٹ موٹ الزام لگانے سے سروکار ہے۔ بلکہ جو جو بھلا ہے۔ وہی بھلا۔ اور جو بُرا ہے۔ وُہی سب لوگ بُرا سمجھیں۔** نہ کوئی کسی پر جھوٹ (کا جادو) چلا سکے۔ نہ صداقت کو کسی سے مسدود کر سکے۔ حق و باطل کے سب پر ظاہر ہو جانے پر بھی جس کی خواہش ہو۔ مانے۔ جس کی خواہش نہ ہو۔ نہ مانے۔ کسی

پر جبر نہیں ۔ یہی نیک لوگوں کی راہ ہے ۔ کہ خواہ اپنے ہوں خواہ پرائے ۔ نقائص کو نقائص اور فضائل کو فضائل سمجھ کر فضائل کو اختیار اور نقائص کو ترک کریں ۔ اور ضدیوں کی ضد اور خواہ مخواہ کی تکرار مدار کم کریں ۔ اور کرائیں ۔ تعصب سے دُنیا میں کیا کیا اندھیر نہیں مچا ۔ اور کیا کیا اندھیر نہیں مچ رہا ۔

سچ تو یہ ہے ۔ کہ اس بے اعتبار لمحہ بھر میں انجام پذیر زندگی میں پرایا نقصان کرنا اور نفع سے خود بھی محروم رہنا اور دوسروں کو بھی محروم رکھنا انسانیت سے بعید ہے ۔

اِس (سملاس) میں جو غلط لکھا گیا ہو ۔ وہ شریف لوگ (مصنف پر) ظاہر کر دیں ۔ درست ہو گا ۔ تو تسلیم کر لیا جائیگا ۔

یہ تحریر اصرار ۔ تعصّب ۔ ضد ۔ حسد ۔ بُغض ۔ مکابرہ ۔ مجادلہ ۔ اور مخاصمت کے دُور کرنے کے لئے لکھی گئی ہے ۔ نہ کہ ان (جذباتِ حیوانی) کو ترقی دینے کے لئے ۔ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے محترز رہ کر ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانا ہمارا اولیں فرض ہے

اب چودھویں سملاس میں اہلِ اسلام کے عقائد (کی تنقید) شرفا کے پیش کرتا ہوں ۔ جو پسند آئے ۔ اسے اختیار ۔ اور جو ناپسند ہو ۔ اُسے ترک کیجئے ۔

عاقلاں را اشارہ کافی است ۔

کیا بے لاگ تحریر ہے ۔ تعصّب اور طرفداری ان الفاظ کی صورت دیکھ کر ہی کوسوں دُور بھاگ جاتی ہے ۔ یہاں فرقہ بندی کا نام نہیں ۔ جانبداری کا نشان نہیں ۔ نقص کو بطور نقص پرایا یعنی قابل ترک سمجھا ہے ۔ اور خوبی

کو بطور خوبی اپنا یعنی قابل اختیار تسلیم کیا ہے ۔ اس سے زیادہ حق پسندی اور حق جوئی کیا ہو سکتی ہے !

ہماری خوش قسمتی سے قرآن کا وہ اُردو ترجمہ موجود ہے ۔ جسے آریہ بھاشا کا جامہ پہنوا کر علمائے اسلام سے تصحیح کرانے کے بعد رشی نے تنقید کا محل بنایا ۔ وہ ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب کا ہے ۔ ناظرین یہ جان کر حیران ہونگے ۔ کہ آریہ بھاشا کے ستیارتھ پرکاش میں درج کیا گیا آیاتِ قرانی کا ترجمہ شاہ رفیع الدین کی عبارت کے زیادہ نزدیک ہے ۔ بہ نسبت اردو ستیارتھ پرکاش میں درج کئے گئے اِس آریہ بھاشا کے ترجمہ در ترجمہ کے ۔ اُردو ستیارتھ پرکاش کی آئندہ اشاعتوں میں بجائے دیگر ترجموں کے شاہ رفیع الدین کی عبادت ہی آریہ بھاشا کے قرآنی حصہ کی جگہ درج کر دی جائے ۔ تو بہتر ہے ۔ شاہ رفیع الدین کی اُردو لغات آریہ بھاشا لغات کے بہت قرین ہیں ۔ مثلاً قرآن کے لفظ ' نفس ' کا ترجمہ اس میں ہر جگہ ' جی ' کیا گیا ہے ۔ آریہ بھاشا میں اسے ' جیو ' لکھا گیا ہے ۔ اور اُردو کے مترجموں نے اسے رُوح کر دیا ہے ۔ ' ریح ' کا ترجمہ شاہ رفیع الدین ' باؤ ' کرتے ہیں ۔ ستیارتھ پرکاش میں بھی اسے ' باو ' لکھا گیا ہے (فقرہ ۱۲۴) اُردو مترجم اسے ' ہوا ' لکھتا ہے ۔ زباندانی کا مذاق رکھنے والے حضرات ان لغات کے لطیف فرق کا مزا لیں گے ۔

شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ کے حاشیہ پر شاہ عبدالقادر کے موضح القران سے ' فائدے ' نقل کئے گئے ہیں ۔ رشی نے اپنی تنقید میں ان حاشیوں کا بھی استعمال کیا ہے ۔ چنانچہ سورہ فاتحہ

کی تنقید کرتے ہوئے مندرجہ ذیل عبارت موضح القرآن سے نقل کی گئی ہے -

یہ سورت اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی - کہ اس طرح کہا کریں -

حضرت محمد صاحب کے واقعہ ابلا مندرجہ سورہ تحریم کے متعلق دو روایات ہیں - ایک ماریہ نام کی باندی کی - اور دوسری شہد پینے کی - تفسیر جلالین میں متقدم الذکر روایت لکھی ہے - تفسیر حسینی میں مؤخر الذکر - رشی دیانند دونوں کا ذکر فرماتے ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے - کہ رشی نے دونوں روائتیں سُنی تھیں - سورہ بروج میں بروج کے معنے تفسیر حسینی میں 'منازل' اور 'دروازہ ہائے قلعہ' کئے گئے ہیں - رشی نے دونوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے - قرآن میں جا بجا کتاب اللہ کی ہدایت کی پرہیزگاروں کے لئے تخصیص کی گئی ہے - تفسیروں میں پرہیزگار کے معنے واضح کئے گئے ہیں ایسا شخص جو ازل سے پرہیزگار بنایا گیا ہے - رشی کا اعتراض ہے - کہ اس پرہیزگار کو ہدایت کی ضرورت کیا ہے؟ کتاب ہذا کے مطالعہ سے ناظر کو جگہ جگہ ایسے نکات ملینگے - جو قرآن اور تفاسیر دونوں کے ساتھ ساتھ پڑھنے سے ہی تنقید کا محل بن سکتے ہیں - معلوم یہ ہوتا ہے - کہ رشی نے قرآن کا ترجمہ بے ساختہ اُٹھا کر آنکھ اُس کی نکتہ چینی نہیں کر ڈالی - بلکہ علمائے اسلام کی بالمشافہ گفتگو اور قرآن کے ترجموں اور تفاسیر سے اسلام کے عقائد کا عمیق علم حاصل کیا ہے - اور پھر اسے تحقیق کی کسوٹی پہ رکھا ہے -

جو نقاد ستیارتھ پرکاش کے چودھویں سملاس پر محققانہ نظر ڈالنا چاہیں۔ اُنہیں ان سب کتب کا مطالعہ ایک ساتھ کرنا چاہیئے۔ پھر وہ رشی کی محنت اور معاملہ فہمی کی داد دیئے بغیر نہ رہیں گے۔

اِس تمام مطالعہ کے بعد ہم نے مولانا ثناء اللہ صاحب کا رسالہ 'حق پرکاش' پڑھا۔ یہ اس لئے کہ ایک مسلمان عالم کے نقطۂ نظر سے رشی کی تحریر پر ناقدانہ نگاہ ڈالنے کا موقعہ مل جائے۔ مولانا نے بجائے عقائد مروجہ اسلام کی خامیوں اور ان پر کئے گئے رشی کے اعتراضات کی موزونیت کا صاف اعتراف کرنے کے خود اسلام کے نئے عقیدے پیش کر دیئے ہیں۔ جو حضرت مولانا کی اپنی ایجاد ہیں۔ یہ تو دوسرے لفظوں میں قرآنی مسلمات کو معترض کے رنگ میں رنگ دینا ہے۔ آپ نے عالم موجودہ کی مصائب کو اعمال کا ثمر تسلیم کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس تسلیم کے منطقی نتیجہ مسلمہ تناسخ کی لابدیت آپ کے ذہن میں نہیں آسکی۔ اور اس کے کچھ صفحے بعد جھٹ یہ بھی تحریر فرما دیا ہے۔ کہ موجودہ سُکھ اور دُکھ کسی عمل انسانی کا نتیجہ نہیں۔ جہاد کو آپ مدافعانہ جہد مانتے ہیں۔ اور اس کی تائید میں وید اور منوسمرتی کو پیش کرتے ہیں۔ جو گویا اس بات کا اعتراف ہے۔ کہ فقہ اسلامی آپ کا ساتھ نہیں دیتا۔ غلمان کو بہشتیوں کی اولاد تصور کرتے ہیں۔ جنت کی شراب کو دُنیوی دُودھ قرار دیا ہے۔ لحم خنزیر کو گرم ممالک کے لئے بالخصوص مضر صحت کہہ کر نہ جانے اس کی حرمت کے متعلق کیا حکم شرعی وضع کرنا چاہا ہے؟ اسلامی مسئلہ تقدیر کو دُور ہی دُور سے خیرباد کہہ گئے ہیں۔ فرشتوں کو ویدک عقیدے کے تینتیس دیوتاؤں کے مثل تسلیم کیا ہے۔ اور یہ حضرت کو معلوم نہیں۔ کہ یہاں یہ دیوتا نشت اتیجہ

براہمن اور ستیارتھ پرکاش کے بیان کے مطابق موسمی کوائف اور مادی
کرّے وغیرہ ذہن انسانی کی گرفت میں آنے والے موجودات ہیں۔
مولانا کتاب ہذا کو ایک بار پڑھ جائیں۔ تو اُمید ہے۔ اسلام اور ویدک
دھرم دونوں کے بارے میں اپنی غلط فہمیوں (غلط فہمی کا بدل غلط بیانی
ہو سکتی ہے۔ جو ہم حضرت مولانا سے ہرگز منسوب نہیں کرنا چاہتے) کے
ازالہ کا سامان پائیں گے۔ ایک جدا باب بھی ہم نے حضرت مولانا کی
کتاب کے نذر کیا ہے۔ جو ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اس
میں حضرت کے ان تصرفات کے حوالے دیئے ہیں۔

مولانا کی کتاب کے مطالعہ کا خاص فائدہ ہمیں یہ ہوا۔ کہ رشی کے
اقتباسات قرآن کے صحیح ہونے کی ایک مسلمان مولوی کے قلم سے سند
مل گئی۔ مولانا نے ستیارتھ پرکاش وغیرہ کتب سے خود اقتباسات
کئے ہیں۔ اور وہ اقتباسات ان کتب کے "پہلے سے تیار" اور شائع شدہ"
اُردو ترجموں کی محض نقل ہیں۔ مگر نقل نقل میں ہی حضرت نے ان کے
ساتھ وہ سلوک کیا ہے۔ کہ ناظر حیران ہے۔ دو چار نمونے ہم نے اس باب
میں عرض کر دیئے ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔ رشی کا دیباچہ سارے کا
سارا حذف فرمایا ہے۔ اور باقی بھی کہاں کہاں اور کیا کیا تصرف فرمایا ہے
دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مولانا کا جواب بذاتہ کیا ہے۔ گالیوں کی بوچھاڑ۔
ہم نے مشتے نمونہ از خروارے کچھ کچھ وہ بھی نقل کر دی ہیں۔ انہیں واپس
بھیجنے کی گستاخی تو ہم کریں گے نہیں۔ ہاں ناظرین کی ضیافت طبع کا سامان
وہ ہمیشہ رہیں گی۔ پھر دعویٰ یہ ہے۔ کہ

کہ ہم اُن کے گرو کو عزت ہی سے یاد کریں گے۔ کیونکہ اسلام کا ہم

کو یہی حکم ہے۔

مولانا نے رشی کے ۱۵۹ پیراگرافوں میں فقط نو مقامات ایسے دکھائے ہیں۔ جہاں انہیں قرآن کا ترجمہ یا غلط یا اِدھر اُدھر کی عبارت سے غیر مربوط ہونے کی شکایت ہے۔ سو ایک جگہ تو قرآن شریف کا ایک لفظ حضرت کی نگاہ سے چوک گیا معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ واحد جمع کے مساوی معنی کا گر نہ جان کر مولانا خواہ مخواہ گرم ہوئے ہیں۔ ایک مقام پر قرآن کے کلام کو بے وجہ جہنمیوں کی دُعا قرار دے دیا ہے۔ دو جگہ عربی کا بے ربط محاورہ اور اس کا اردو میں مہمل ترجمہ لفظی مغالطے کا موجب ہوا ہے۔ ایک جگہ قرآن کی عبارت کا ترجمہ اردو مترجم نے اس طرح کر رکھا تھا۔ کہ لفظ اِدھر کے اُدھر ہو گئے تھے۔ صحیح ترجمہ کرو۔ تو عبارت مہمل تھی۔ اسے رشی نے تھوڑے سے تصرف سے بامعنی کر دیا۔ ہم نے سفارش کی ہے۔ کہ اہلِ قرآن خود قرآن کے فائدے کے لئے یہ تحریف قبول فرمالیں۔ تو اچھا ہے ہمیں تلاش کسی ایسے تصرف کی تھی۔ جس کی تصحیح کے بعد رشی کے اعتراض کی معقولیت قائم نہ رہتی ہو۔ ہم نے مولانا سے عرض کی ہے۔ کہ ستیارتھ پرکاش کے اقتباس کی جگہ آپ اپنا ترجمہ رکھ لیں۔ اور پھر دیکھیں۔ اعتراض ویسے کا ویسا بنا رہتا ہے۔

رشی کی تنقید کی ترتیب قرآن کی آیات کی ترتیب ہیں۔ چونکہ خود قرآن میں مضامین کا کوئی سلسلہ نہیں۔ اعادہ جابجا ہوا ہے۔ اس لئے رشی کے اعتراضات میں اعادہ بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔ اور مضامین کی ترتیب بھی نہیں ہو سکی۔ ہم نے کتاب ہذا میں تنقید کے چند موضوع مقرر کئے ہیں۔ ہر موضوع پر ایک ایک باب میں بحث کی ہے۔ آیات بالعموم

ڈھی ہلیش کی ہیں۔ جو رشی کی تنقید کا محل ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں وضاحت کے
کے لئے کوئی کوئی آیت نئی بھی بڑھا دی ہے۔ اس ترتیب سے جہاں
یہ فائدہ ہوا ہے۔ کہ ایک ایک موضوع کی آیات کی تنقید یکجا ہو گئی
ہے۔ اور بحث کے نکات میں تھکان لانے والا بار بار کا اعادہ۔ اور ان
نکات کا جدا جدا بیان ہونے کی وجہ سے ان کی جدا جدا توضیح میں ادھورا
پن نہیں رہا۔ وہاں رشی کی تنقید مضامین کے لحاظ سے ایک جدول میں آ
گئی ہے۔ اور یہ حیرت انگیز امر بھی ناظرین کے سامنے آجانے کا امکان
ہو گیا ہے۔ کہ رشی کا تبصرہ قرآن کتنا بسیط ہے۔ رکیک مسائل کو چھوڑ
کر باقی سب موٹے موٹے مسلمات اسلام پر رشی نے ریویو کیا ہے۔
اور منطقی اور فلسفی ہر پہلو سے ریویو کیا ہے۔ اس بے ترتیبی کے عالم
میں اتنی مکمل اور بے شو د حذف تنقید رشی کی ذہنی گرفت کا معجزہ ہے
ہماری تحریر کا نفس مضمون سراسر رشی کی تحریر سے اخذ کیا گیا ہے۔

آخری باب میں سر سید احمد خاں کی تفسیر احمدی اور مولانا محمد علی کی
تفسیر ہولی قرآن کی بنا پہ یہ ثابت کیا گیا ہے۔ کہ رشی دیانند کی محنت
اکارت نہیں گئی۔ اہل اسلام نے رشی کے اعتراضات کو اپنے دل و
دماغ میں جگہ دی ہے۔ اور قرآن کی موجودہ تاویلات میں رشی کے
عقائد کو اپنے بیان کردہ معانی کی صحت کا گویا معیار مقرر کیا ہے اس
سے زیادہ فتح و نصرت کسی صاحب دعویٰ کو کسی بھی عدالت میں کیا
نصیب ہوگی۔ کہ فریق ثانی اس کے دعویٰ کے عین مطابق اپنا جواب
بنالے؛

اگر اہل اسلام رشی کے استدلال کے اس قدر دلدادہ ہوئے

ہیں۔ کہ انہوں نے رشی کی بتلائی راہ قرآن میں سے نکال لی ہے۔ تو ہم بھی کیوں نہ ان اہل اسلام کے ہمقدم ہو کر اس راہ کو اتنا وسیع کر دیں۔ کہ قرآن میں صاف وید کی جھلک نظر آنے لگے۔ ہم نے قرآن پڑھا ہے۔ اور ہمیں قرآن اور اسلام میں بعد المشرقین نظر آتا ہے۔ رشی کے مدنظر اسلامی قرآن تھا۔ ہمارے مدنظر رشی کا یہ قول ہے۔

اور جو تھوڑا بہت سچ اس میں ہے۔ وہ وید وغیرہ علمی کتب کے مطابق ہونے سے مجھے منظور ہے۔

(ستیارتھ پرکاش۔ چودھواں سملاس خاتمہ)

ہمیں قرآن کے اپنے متن میں عدم سے موجودات کے خلق ہونے کا نہ فقط عدم اقرار بلکہ صاف تردید ملی ہے۔ تناسخ کا نہ صرف اعتراف ملا ہے۔ بلکہ اسی کی بنا پر اعمال کی سزا و جزا کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اور قرآن کو ازلی الہام الٰہی نہیں۔ بلکہ کسی خاص وقت اور خاص قوم کے لئے وضع کی گئی سمرتی کہا گیا ہے۔ قیامت دو طرح کی بتائی گئی ہے۔ ایک پرلے۔ دوسری دم بدم واقع ہوتی رہنے والی حساب کی گھڑی۔ غرض کئی امور ہیں۔ جن میں قرآن نے وید کے مسلمات کا عربی الفاظ میں تکرار کیا ہے۔ ہم ان مضامین پر ایک اور کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے۔ کہ آریوں اور مسلمانوں میں ذہنی اتحاد کی وہ پکی بنیاد ہو گی[1]۔

---

[1] ان میں سے کچھ مضامین پر گورو کل یونیورسٹی میں لکچر دیئے جا چکے ہیں۔ جو آریہ بھاشا میں طبع بھی ہوئے ہیں۔ عنقریب کتاب کی صورت میں ہدیۂ ناظرین ہونگے (مصنف)

آخر میں اُپنشد کے لفظوں میں پرماتما سے پرارتھنا ہے ؎

یا رب ہمیں تحقیق کی توفیق عطا کر
دے ذوقِ صداقت حظِ باطل کو مٹا کر
اِس کلبۂ تاریک میں ہو جلوۂ خورشید
کر شامِ فنا محو۔ عیاں صبحِ بقا کر

چھوپتی

بسم اللہ ہی غلط

مروّجہ قرآن کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا ہے۔ سورہ توبہ کے سوا اور سب سورتوں کے شروع میں یہ کلمہ تسمیہ پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں اس پاک کلمے کی قرأت اہلِ اسلام کو دیگر بھی ہر کام کے شروع میں کرنی ہوتی ہے۔

رشی دیانند کو اس کلمے پر دو اعتراض ہیں۔ اول یہ کہ قرآن کے شروع میں یہ کلمہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے الہام نہیں ہوا۔ دوسرا یہ کہ اہلِ اسلام کچھ ایسے کاموں کے آغاز میں بھی اس کلمے کی قرأت کرتے ہیں۔ جو اس پاک کلمے کی شان کے شایاں نہیں۔

پہلا اعتراض قرآن کے انداز بیان اور روایات نزول قرآن سے تعلق رکھتا ہے۔ حدیثوں میں روایت ہے۔ کہ سب سے پہلے سورہ

علق کی پہلی پانچ آیتوں کا الہام ہوا تھا۔ حضرت جبرئیل نے حضرت محمد سے کہا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ

پڑھ نام سے اپنے رب کے جس نے پیدا کیا۔

ان آیات کے بعد سورہ مزمل کے نازل ہونے کی روایت ہے اس کی ابتدا یوں ہوئی ہے۔

يَا اَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ !

اے کپڑوں میں لپٹے ہوئے۔

یہ دونوں آیات حضرت محمد صاحب سے خطاب کی گئی ہیں۔ اہل اسلام ایسے خطاب کو یا حضرت محمد کے لئے خاص یا ان کے تمام پیرووں کے لئے عام قرار دیتے ہیں۔ جب کسی آیت کی اہل اسلام سے قرأت کرانی ہو۔ تو وہاں اِقْرَاْ 'پڑھ' یا قُل 'کہہ' تمہیداً اس آیت کے شروع میں بطور الہام کے جزو کے درج ہوتا ہے۔ یہ ہے قرآن کا انداز بیان۔ جس سے الہام شروع ہوا تھا۔

اب اگر اللہ میاں کو الہام قرآن کا آغاز بسم اللہ سے کرنا ہوتا۔ تو سورہ علق کے شروع میں حضرت جبرائیل نے بسم اللہ پڑھی ہوتی۔ یا اقرا کے بعد باسم ربک کی جگہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا ہوتا۔

موضح القرآن میں سورہ فاتحہ کے حاشیہ پہ جو مروجہ قرآن کی پہلی سورہ ہے۔ لکھا ہے۔

یہ سورت اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی۔ کہ اس طرح کہا کریں۔

اگر یہ صورت ہوتی۔ تو اس کے پہلے 'قل' یا 'اقرا' ضرور پڑھا جاتا۔ قرآن کی کئی سورتوں کا آغاز خود قرآن کی توصیف سے ہوا ہے۔ چنانچہ سورہ بقر کے جو قرآن کی دوسری سورۃ ہے۔ شروع میں ہی فرمایا ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔

یہ کتاب ہے۔ اس میں کچھ شک (کی گنجائش) نہیں۔ ہدایت کرتی ہے پرہیزگاروں کو۔

اتقان میں روایت ہے۔ کہ ابن مسعود اپنے قرآن میں سورہ فاتحہ کو درج نہیں کرتے تھے۔ اُن کے نسخہ قرآن کا آغاز سورہ بقر سے ہوتا تھا۔ وہ حضرت محمد کے صحابہ میں سے تھے۔ قرآن کی تمہید کے طور پر یہ آیت جس کا ہم نے اوپر اندراج کیا ہے۔ موزوں ہے۔ رشی دیانند نے قرآن کی ابتدا کے لئے (اگر اسے الہامی مانا جائے)۔ یہی کلمات تجویز کئے ہیں۔ یہ تجویز قرآن کے اپنے انداز کے عین مطابق ہے۔ اور ابن مسعود اس انداز کے پابند تھے۔

مولانا محمد علی اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے صفحہ ۸۲ پر لکھتے ہیں۔

بعض کا خیال تھا۔ کہ بسم اللہ جس سے قرآن کی ہر سورہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ بطور ابتدائی کلمہ کے ایزاد کیا گیا ہے۔ یہ اس سورہ کا حصّہ نہیں۔

ایک اور بات جو بسم اللہ کے قرآن شریف میں باہر سے ایزاد ہونے کی تائید کرتی ہے۔ وہ ہے سورہ توبہ کے شروع میں کلمہ تسمیہ کا عدم اندراج۔ وہاں کاتبوں کا سہو ہے۔ یا کوئی اور وجہ ہے جس سے کلمہ تسمیہ معرض

تحریر میں نہیں آیا۔ یہ عدم اندراج قاریوں میں اس بحث کا بھی موجب ہوا ہے۔ کہ سورہ انفال اور سورہ توبہ جن کے درمیان بسم اللہ محذوف ہے۔ دو جدا سورتیں ہیں۔ یا ایک سورہ کے دو جزو۔ قیاس یہ ہوتا ہے۔ کہ بسم اللہ قرآن کا حصہ نہیں۔ لکھنے والوں کی طرف سے تبرکاً تمہید کے طور پر لگا دیا گیا ہے۔ اور بعد میں الہام کا جزو سمجھ لیا گیا ہے۔

یہی حال سورہ فاتحہ کا ہے۔ یہ سورہ ہے تو اہل اسلام کے ورد کے لئے۔ لیکن اس کے آغاز میں بھی 'قل' یا 'اِقرَا' درج نہیں۔ اور اسے بھی ابن مسعود نے اپنے مصحف میں محذوف کر دیا تھا۔

سوامی دیانند کا اعتراض ایک تاریخی اعتراض ہے۔ اگر بسم اللہ اور سورہ فاتحہ قرآن میں بعد میں ملا دیئے گئے ہوں۔ تو باقی کتاب کی صحت کا کیا اعتبار؟ اگر بسم اللہ ہی غلط ہو۔ تو انشا و املا کے تو پھر کیا کہنے؟

بعض مجیبوں نے اس اعتراض کا الزامی جواب وید کے انداز سے دیا ہے۔ کہ وہاں بھی منتروں کے منتر اور سوکتوں کے سوکت پرماتما کی توصیف میں آئے ہیں۔ اور ان کے شروع میں کوئی تمہید وحی نہیں ہوئی۔ وید کا الہام ذہنی ہے۔ زبانی نہیں۔ رشیوں کے دلوں کی صورت اس الہام کے وقت داعی (پرارتھی) کی صورت تھی۔ انہیں 'قل' کہنے کی ضرورت کیا؟ وید میں تو ہر جگہ یہی انداز برتا ہے۔ بعد کے وید پاٹھی عبارت کے رجحان سے تمہیدی مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ یہی نہیں۔ اس طریق کے اتباع میں سنسکرت علم ادب میں اب تک یہ قاعدہ برتا جاتا ہے۔ کہ متکلم اور مخاطب کا نام لکھتے نہیں۔ ناظر عبارت کے

معنوں سے قیاس کرتا ہے۔ قرآن میں ایسے تمہیدی الفاظ صریحاً درج کئے ہیں۔ کیونکہ قرآن کا الہام زبانی ہے۔ جبرئیل قرأت کراتے ہیں۔ اور حضرت محمد کرتے ہیں۔ اس میں "کہ" کہنا ہوتا ہے۔ ممکن ہے۔ کوئی مولانا اس اندراج کو نمونہ قرار دے کر فرمائیں۔ کہ دیگر مقامات پر اس تمہید کی طرح ایسی ہی اور تمہید خود قیاس کرنی چاہئے۔ عرض یہ ہے۔ کہ نمونہ کتاب کے شروع میں دینا چاہئے تھا۔ نہ کہ آگے چل کر۔ نمونہ اور وہ بعد میں درج کیا جائے، قواعد انشا کے خلاف ہے۔

رشی دیانند کا دوسرا اعتراض بسم اللہ کے عام استعمال پر ہے۔ رشی نے تین ایسے افعال کا نام لیا ہے۔ جو ہر قوم اور ہر مذہب کی نظر میں مذموم ہیں۔ (۱) قرآن میں گوشت خواری کا جواز ہے۔ اور قربانی کا حکم ہے۔ اس پر ہم اپنی رائے نہ دے کر شیخ خدا بخش صاحب ایم اے پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی کی ایک تحریر سے جو انہوں نے عید الضحےٰ کے موقعہ پر کلکتہ کے مقامی اخبارات میں شائع کرائی تھی۔ مندرجۂ ذیل اقتباس درج کئے دیتے ہیں۔

"سچ سچ۔ سچ سچ۔ بڑا خدا۔ رحمٰن اور رحیم خدا آج خون کی ندیوں کا۔ چیختے ہوئے جانوروں کی ناقابل بیان تکلیف کا خواہشمند نہیں۔ کفارہ؟ .. اصل کفارہ وہ ہے۔ جو انسان کے اپنے دل میں ہوتا ہے۔ تمام حیوانات کی طرف اپنا جذبہ تبدیل کر دیا جائے۔ زمانہ مستقبل کا مذہب کفارے کے سخت اور بے رحمانہ طریق کو ترک کر دے گا۔ تاکہ وہ ان دنوں پر رحم بھری حقارت سے نظر کرے ... جب قربانی کے معنی اپنے نفس کے سوا کسی اور چیز یا کسی اور ہستی کی قربانی تھے۔" (ترجمہ از موڈرن ریویو)

رحمٰن اور رحیم پرماتما کا نام لینے کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا۔ کہ ہم بے زبان جانوروں سے رحم کا برتاؤ کرتے۔ لیکن کیا ہم نے اس کے عین برعکس۔ یہ بات ہر سلیم الطبع کو کھٹکتی ہے۔ موضح القرآن میں لکھا ہے۔ کہ جب کسی جانور کو ذبح کریں۔ اس پر بسم اللہ اور اللہ اکبر پڑھ لیا کریں۔ قرآن میں جہاں کہیں حلال حرام کا ذکر آیا ہے۔ وہاں حلال اس ذبیحہ کو قرار دیا ہے۔ جس پر اللہ کا نام پڑھا گیا ہو۔ کلمہ پاکیزہ ہے۔ رحمانیہ ہے۔ لیکن اس کا استعمال اس کے منشا کے عین خلاف ہے۔

(۲) اسلام میں کثرت ازدواج کی اجازت تو ہے ہی۔ بیویوں کے علاوہ لونڈیوں کا بھی جواز ہے۔ فرمایا ہے۔

والذین ھم لفروجہم حافظون الا علی الازواجھم اوما ملکت ایمانہم۔ (سورہ المومنین۔ ع۱)

اور جو حفاظت کرتے ہیں اپنے شرمگاہوں کی۔ مگر اپنی بیویوں سے یا باندیوں سے۔

تفسیر جلالین میں سورہ بقر۔ آیۃ ۲۲۳

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ جاؤ اپنی کھیتی کی طرف جس طرح چاہو کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"صحبت کرو۔ جس طرح چاہو۔ اٹھ کر۔ بیٹھ کر۔ لیٹ کر۔ اُلٹے سیدھے ... ... بوقت صحبت بسم اللہ کہہ لیا کرو۔"

بسم اللہ کا تعلق کثرت ازدواج سے ہو۔ لونڈیوں کے جواز سے ہو۔

اس طرح کی صحبت سے ہو۔ یہ سوامی دیانند کو گوارا نہیں۔

(۲۸)، سورہ آل عمران - آیتہ ۲۷

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِن دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ .. .. .. اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً۔

مت پکڑیں مسلمان کافروں کو دوست سوائے مومنوں کے .. .. .. سوائے اس کے کہ ان سے ڈریں - از راہ تقیہ (دوست پکڑیں)

کی تفسیر میں لکھا ہے۔

اگر بوجہ کسی خوف کے از راہ تقیہ (کافروں کے ساتھ) زبان سے اقرار دوستی کا کر لیا جائے - اور دل میں ان کے بغض اور دشمنی رہے تو اس کا کچھ ہرج نہیں .. .. .. جس جگہ اسلام نے پوری قوت نہیں پکڑی - وہاں اب بھی یہ حکم باقی ہے۔

سوامی دیانند اس دروغ کی اجازت بھی الہامی کتاب میں نہیں دے سکتے۔ ایسے احکامات یا افعال کا آغاز رحیم اور رحمٰن - پاک اور سچے اللہ کے نام سے ہو - یہ سوامی کو منظور نہیں۔

اللہ تعالیٰ ایک محدود شخص ہے

ہر مذہب میں سب سے اعلیٰ تصوّر پرماتما کا ہے۔ قرآن شریف میں اسے اللہ تعالیٰ کہا گیا ہے۔ قرآن کے بعض بیانات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلام میں اللہ کا تصوّر کسی غیر محدود ذات کا تصوّر نہیں۔ بلکہ کسی مکاناً۔ زماناً۔ قدرتاً محدود شخص کا تصور ہے۔ مکانی محدودیت کے شاہد مندرجہ ذیل حوالہ جات ہیں۔ باقی اقسام کی محدودیت کا ذکر آگے چل کر کیا جائیگا۔

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ج (سورہ یونس۔ آیت ۳)

تحقیق پروردگار تمہارا اللہ ہے۔ جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں۔ پھر قرار پکڑا اوپر عرش کے۔

تفسیر حسینی میں لکھا ہے۔

ما بدو ایمان داریم و تاویل آں بحق گزاریم

ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور اس کی تاویل اللہ میاں پہ چھوڑتے ہیں

سورہٗ ہود میں آیا ہے۔

وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ وَّکَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ (سورہ ہود۔ آیت ۷)

اور جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں۔ اور ہے
تخت اس کا پانی پر۔
اس پر تفسیر حسینی میں لکھا ہے۔
در برخے از تفاسیر آوردہ کہ حق تعالیٰ در مبدء آفرینش یاقوتے سبز
بیافرید۔ و بنظر ہیبت در آں نگریست۔ آں جوہر آب شد۔ پس
حق سبحانہٗ و تعالیٰ باد را بیافرید۔ و آب را بر بالائے او بداشت
و عرش را بر زبر آب جائے داد۔ یعنی
کچھ تفسیروں میں ذکر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش کی ابتدا میں ایک
سبز یاقوت بنایا اور اسے ہیبت کی نظر سے دیکھا۔ وہ جوہر پانی
ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہوا بنائی۔ اور پانی کو اُس پر رکھا۔ اور
عرش کو پانی کے اوپر جگہ دی۔
ان حوالوں سے ثابت ہوا۔ کہ عرش کوئی مجسم چیز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
اس پر قرار پکڑنے سے مجسم معلوم ہوتا ہے۔ ہوا کے اوپر پانی ہے۔ پانی
کے اُوپر عرش ہے۔ اور عرش کے اُوپر اللہ میاں۔ نیچے کا حصہ قدرتاً
اللہ میاں سے خالی رہیگا۔
سورہ حاقہ میں اس مکانی محدودیت کو خود قرآن شریف کے لفظوں
میں واضح کیا ہے

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ

اور اُٹھائیں گے عرش رب تیرے کا اُوپر اپنے اُس دن آٹھ شخص۔
جسے آٹھ شخص اُٹھائیں گے۔ اس کے مجسم ہونے میں کیا شک رہا؟
یہ آٹھ کون ہیں؟ تفسیر حسینی میں لکھا ہے۔

در معالم آوردہ کہ در آں روز حملہ عرش ہشت باشند۔ بہ صورت بز کوہی۔ از سم ایشاں تا بزانو مسافت آں مقدارے بود۔ کہ از آسمانے تا بہ آسمانے۔ یعنی

معالم میں درج ہے۔ کہ اس روز تخت کے اٹھانے والے آٹھ ہونگے جن کی صورت پہاڑی بکرے کی ہوگی۔ ان کے سموں سے زانوؤں تک اتنا فاصلہ ہوگا۔ جتنا ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک۔

سورہ سجدہ میں فرمایا ہے۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ٥ (سورہ سجدہ آیت ۴)

تدبیر کرتا ہے امر کی آسمان سے طرف زمین کی۔ پھر چڑھ جاتا ہے طرف اس کے ایک دن میں۔ جس کی مقدار ہے ہزار برس تمہاری گنتی سے۔

آسمان سے زمین کے امور کی پرداخت کرنے والا۔ پھر ہزار سال میں اوپر چڑھنے والا غیر مجسّم کیسے ہو سکتا ہے؟ بعض کا خیال ہے۔ کہ یہاں چڑھنا اللہ میاں کا نہیں۔ بلکہ فرشتے کا مذکور ہے۔ تو بھی اللہ زمین سے اتنا دُور تو ہے ہی۔ کہ فرشتوں کو اس کے پاس جاتے ہزار برس لگتے ہیں۔ وہ بھی تو مجسم ہی ہوا۔

سورہ معارج میں کہا ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلَٰئِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ ٥ (سورہ معارج آیت ۴)

چڑھتے ہیں فرشتے اور روح طرف اس کی اس دن میں جس کی مقدار

ہے پچاس ہزار سال۔

ایک ہزار اور پچاس ہزار سال کے تفاوت سے قطع نظر۔ اللہ تعالیٰ کی دُوری اور محدودیت کا ذکر یہاں بھی صریح الفاظ میں ہوا ہے۔

سورہ واقعہ کی ابتدائی آیتوں میں بہشتیوں اور دوزخیوں کا ذکر ہے۔ بہشتیوں کو اصحاب المیمنۃ یعنی دائیں طرف والے اور دوزخیوں کو اصحاب المشئمۃ یعنی بائیں طرف والے کہا گیا ہے۔ تفسیر حسینی میں ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ "(اصحاب المیمنۃ) بہ بہشت روند د آں در یمین عرش است" یعنی وہ بہشت میں جائیں گے اور وہ عرش کے دائیں طرف ہے۔ اور (اصحاب المشئمۃ) 'بدوزخ برند ودوزخ بر چپ عرش است' یعنی انہیں دوزخ میں لے جائیں گے اور دوزخ عرش کے بائیں طرف ہے۔ جب عرش کی دائیں اور بائیں طرفیں ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہاں جانے والوں کو دائیں طرف کے لوگ اور بائیں طرف کے لوگ کہا جاتا ہے۔ تو عرش کو غیر محدود کون کہہ سکتا ہے؟ محدود مکان کا مکین ہونے سے اللہ میاں بھی محدود ہی ہوئے۔

سورہ اعراف میں آیا ہے۔

فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ۝

(سورہ اعراف۔ آیت ۱۴۳)

پھر جب تجلّی کی رب اس کے نے پہاڑ کی طرف اور کیا اسے ریزہ ریزہ اور گر پڑا موسیٰ بیہوش۔

یہاں پرماتما کی اس جیوتی کا ذکر نہیں۔ جو ہے تو کون و مکاں کی محیط لیکن انسان نقص بصیرت کی وجہ سے اسے پہچانتا نہیں۔ بلکہ کسی ایسے نور

کا ذکر ہے۔ جس کے ظاہر ہونے سے پہاڑ ٹوٹ گیا۔ یہ نور جس کا اثر جسمانی ہے۔ رُوحانی نہیں۔ جسمانی ہوگا یعنی بجلی کی قسم کا۔ جس کا اظہار محدود ہے۔ اور اسے دیکھ کر موسیٰ بیہوش ہوا۔ دوسرے لفظوں میں پرماتما کا نور آنکھوں کی بصارت کا مرجع بھی ہے۔ چنانچہ موضح القرآن میں اِسی آیت پر فرمایا ہے۔

"اس سے معلوم ہوا۔ کہ حق تعالیٰ کو دیکھنا ہو سکتا ہے۔"

اس نور کو محدود نہ کہیں تو کیا کہیں ؟

سورہ نور میں ارشاد کیا ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ

اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ مثل اس طاق کے کہ جس میں چراغ ہو۔ اور وہ چراغ شیشے میں ہو۔ وہ شیشہ گویا ایک تارا ہے روشن ہے ایک درخت کے تیل سے کہ مبارک زیتون کا ہے۔ نہ مشرق کی طرف کا ہے۔ نہ مغرب کی طرف کا ہے۔ نزدیک ہے تیل اس کا کہ روشن ہو جائے۔ اگرچہ نہ لگے اس کو آگ۔

متعدد تفسیریں دیکھنے پر سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ اس استعارہ در استعارہ عبارت کا مفہوم کیا ہے۔ ہاں یہ صاف ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر جسمانیت سے اُوپر اُٹھ نہیں سکا۔ طاق کیا ہے ؟ چراغ کیا ؟ شیشہ کیا ؟ اور زیتون کا تیل کیا ؟ اللہ نور ہے اور مثل طاق کے ہے۔ اور تیل بغیر آگ کے

روشن ہونے والا ہے - کچھ معمّہ سا ہے - جس کی باریکی ہماری موٹی سمجھ میں نہیں آتی -

سورہ بقر کی آیات ۳۲ تا ۳۹ - سورہ اعراف کی آیات ۹ تا ۱۵ - سورہ ص کی آیات ۷۰ تا ۸۷ وغیرہ مقامات پر اللہ میاں کا فرشتوں - آدم اور شیطان سے مکالمہ درج ہے - اس مکالمے میں آدم کو تعلیم دے کر بہشت میں داخل کیا ہے - فرشتوں نے پہلے تو تکبر کیا ہے - لیکن پھر سجدہ کرنے پر راضی ہو گئے ہیں - اور شیطان شروع سے آخر تک باغی بنا رہا - اور اُسے تین دن کی مہلت دی گئی - گفتگو کا انداز ایک مجسم شخص کا ہے - جو ڈراتا ہے دھمکاتا ہے - اور پھر بے بس ہو کر واقعات کی رَو کو اُس کے اپنے ڈھنگ سے بہنے دیتا ہے - اس مکالمے کے حوالے انسان اور شیطان کے باب میں درج ہیں - وہاں ملاحظہ کیجئے -

سورہ صٓ میں آدم کو پیدا کرنے کی دلیل فرمائی ہے -

خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ط

بنایا مَیں نے ساتھ دونوں ہاتھوں کے -

اگر یہاں ہاتھوں کا استعمال بطور استعارہ بیان کیا ہو - تو اس سے آدم کی خلقت کی خصوصیت کچھ نہیں رہتی - کیونکہ بنایا تو اوروں کو بھی اللہ نے ہے - تو وہ مسجود کیوں نہیں ؟ دو ہاتھوں کی خصوصیت حقیقی ہاتھوں پر دال ہے - جو مجسم ہونے کی علامت ہے -

سورہ شوریٰ میں فرمایا ہے -

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا (سورہ شوریٰ - آیت ۵۱)

اور نہیں ہے کسی آدمی کے لئے کہ اللہ بات کرے اس سے۔
مگر اشارے سے یا پیچھے سے پردے کے۔ یا بھیجے پیغام لانے والا۔
اگر اللہ انسان کے اپنے اندر موجود ہے۔ تو اس کا کلام بغیر کسی
واسطے کے ہو سکنا چاہیئے۔ اشارہ۔ پردہ اور فرشتہ ہر جگہ موجود خدا
کس لئے استعمال کرے گا؟
تفسیر حسینی میں اسی آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔
در موضح آوردہ کہ خدا با رسول اللہ صلعم سخن گفت از ورائے حجابین۔
یعنی حضرت رسالت پناہ در دو حجاب بود۔ کہ سخن خدا شنید۔
حجابے از سرخ۔ وحجابے از مروارید سپید۔ ومسیرت درمیان ہر دو
حجاب ہفتاد سالہ راہ بود۔
موضح میں لکھا ہے۔ کہ خدا نے رسول اللہ کے ساتھ دو پردوں کے
پیچھے سے کلام کیا۔ یعنی حضرت رسول دو پردوں کے بیچ میں تھے
جب اُنہوں نے خدا کا کلام سنا۔ ایک پردہ سُرخ زری کا تھا۔
اور ایک حجاب سفید موتیوں کا۔ اور ان کے درمیان فاصلہ ستر سال
کی مسافت کا تھا۔
پردہ خدا اور ماسوا کے درمیان حد فاصل ہونے کے علاوہ اور کیا کام
دے سکتا ہے؟ رسول نے پردے میں خدا سے کلام کیا۔ تو خدا بھی تو اُسی
پردے میں ہو گا۔
سورہ نسا میں کہا ہے۔
یَا اَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَکُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَاٰمِنُوْا
(سورہ نسا۔ آیت ۶۲)

اے لوگو! تحقیق آیا تمہارے پاس پیغمبر ساتھ سچی بات کے تمہارے
رب کے پاس سے۔ پس ایمان لاؤ۔
پیغمبر بھی انسان ہے۔ اور جب وہ کوئی حق بات لاتا ہے۔ تو اس
کا ذریعہ مندرجہ بالا تین ذرائع میں سے ایک ہوگا۔ یا تو وہ اللہ میاں کا
اشارہ اخذ کریگا۔ یا پردے میں ہو کر بات کرے گا۔ یا فرشتے کے ذریعہ
کلام سنے گا۔ دوسرے لفظوں میں اللہ محدود المکان رہے گا۔ کیونکہ وہ
دیگر خلائق سے الگ ہے۔ اور رسول سے بھی بے واسطہ کلام نہیں فرماتا۔
سورۃ قدر میں ارشاد ہے۔
تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ (قدر ۴)
اُترتے ہیں فرشتے اور روح ساتھ حکم رب اپنے کے واسطے ہر کام
کے۔
سورہ فجر میں ذکر ہے۔
وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ○ وَجِایْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ
(سورہ فجر۔ آیت ۲۳)
اور آئے گا رب تیرا اور فرشتے صف باندھ کر۔ اور لایا جائیگا
اس دن دوزخ۔
یہ ذکر روز قیامت کا ہے۔ اس دن بے گناہ اور گناہگار سب کے
سامنے رب آئیگا۔ جس سے ثابت ہوا۔ کہ اس ظہور کے معنے ایسا ظہور
نہیں جو مرتاض لوگوں کو صفائی قلب سے حاصل ہوتا ہے۔ اور عام
لوگ اپنے قلب کی کثافت کی وجہ سے اس سے محروم رہتے ہیں کیونکہ
گنہگاروں کا قلب تو تب بھی صاف نہ ہوگا۔ ان کا آئینہ دل زنگ آلود

ہوگا۔ اور ان کے سامنے رب آئے گا۔ یہ ظہور جسمانی ہے۔ تفسیر حسینی
میں اسے اور صاف کر دیا ہے۔ لکھا ہے۔ کہ

(دوزخ را) بر چپ عرش بدارند۔ یعنی
دوزخ کو عرش کے بائیں رکھینگے

جب عرش کا دایاں بایاں ہیں۔ تو وہ بہر حال مجسّم ہی ہوا۔ وہ دایاں
بایاں درحقیقت عرش نشیں کا ہی ہوگا۔ مندرجہ بالا حوالجات اللہ تعالیٰ
کی محدودیت کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ ان پر کسی حاشیئے کی ضرورت نہیں۔
زمین آسمان بنا کر عرش پر متمکن ہونا۔ عرش کا پانی پر رکھا جانا۔
آٹھ فرشتوں سے اٹھایا جانا۔ ہزار یا پچاس ہزار سال میں خود اللہ
میاں کا زمین سے آسمان تک یا فرشتہ کا یہ فاصلہ طے کر کے اس
کی طرف جانا۔ عرش یعنی عرش نشین کے دائیں بہشت اور بائیں دوزخ
ہونا۔ اللہ کا آگ کی طرح چمکنا اور پہاڑ کو ریزہ ریزہ اور موسیٰ کو بیہوش
کرنا۔ طاق۔ چراغ۔ زیتون کا تیل۔ یا ان میں کا نور ہونا۔ ڈرانا۔ دھمکانا
اور پھر چپ ہو رہنا۔ دو ہاتھوں سے پتلا تیار کرنا۔ اشارہ۔ پردہ یا
فرشتے کے توسل سے بات کرنا۔ فرشتوں وغیرہ کا اس کی طرف سے آنا
جانا۔ اور روز قیامت اس کا خاص ظہور ہونا محدودیت اور تجسیم کے
صریح نشان ہیں +
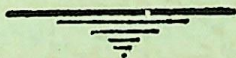
تقدیر

اسلام کا ایک مسئلہ جس پر بعض دیگر مذاہب کو اعتراض ہے۔ مسئلہ تقدیر ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں۔ کہ عالم میں جو کچھ نیک و بد ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ازلی ہے ماسوا اس کے سب موجود مخلوق ہوئے ہیں۔ یعنی وہ عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ ان کی ذات اور صفات دونوں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہیں۔ کوئی نیک ہوا۔ تو اس کی یہ وجہ نہیں۔ کہ وہ اپنی مرضی اور اپنی کوشش سے نیک ہو گیا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اللہ نے اسے نیک بنایا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اس پر آریہ سماج کی تنقید یہ ہے۔ کہ اگر ہمارے نیک اور بد اعمال ہماری مرضی سے نہیں۔ بلکہ اللہ کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ اور ہم فعل کرنے میں مجبور محض ہیں۔ تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے بُرے بھلے کی ذمہ داری ہم پر نہ ڈالی جائے۔ بلکہ فاعل حقیقی کو ہی ان کا ذمہ دار گردانا جائے۔ اور دوزخ اور بہشت ہمارے لئے قائم نہ کئے جائیں۔ اسلام اپنے عقیدہ تقدیر کے اس منطقی نتیجہ کو قبول کرتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے نہ صرف ہماری طبیعتیں روزِ ازل سے وضع فرما دی ہیں۔ نہ صرف ہمارے گذشتہ۔ حال اور مستقبل تینوں زمانوں کے اعمال کا اندراج لوحِ محفوظ میں پہلے سے فرما دیا ہے۔ بلکہ ہم میں سے بعض کو بہشت کے لئے اور بعض کو دوزخ

کے لئے بھی مخصوص کر دیا ہے۔ اس عقیدے کے ہوتے نیک مساعی۔ بلند حوصلگی۔ عالی عزم کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ ہم اس عقیدے کو قرآن اور اس کے مفسرین کے اپنے الفاظ میں پیش کریں گے۔

سورہ فاتحہ میں آیا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

راستہ اُن کا جن پر نعمت کی تُو نے۔ نہ اُن کا جن پر غضب ہوا نہ گمراہوں کا۔

اس پر تفسیر حسینی میں تحریر ہے۔

نہ راہ آں کسانیکہ خشم گرفتہ بر ایشاں یعنی قبل از وجود معرض غضب تو آمدہ اند۔ وبداں سبب بر کفر اقدام نمودہ۔

نہ اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے غضب کیا۔ یعنی موجود ہونے سے پیشتر تیرے غضب کا نشانہ ہوئے۔ اور اس سبب سے کافر ہوئے۔

اگر اسلام اور کفر کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے بعض اشخاص کے لئے مختص کر دیا ہے۔ تو پھر اب تبلیغ کے کیا معنی؟ اور کافروں کا کیا گناہ کہ وہ اسلام کو قبول نہیں کرتے۔ مندرجہ بالا عبارت میں "موجود ہونے سے پہلے" اور "اس سبب سے" یہ دو کلمات بالخصوص قابل توجہ ناظرین ہیں۔

سورہ بقر میں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ

لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ (سورہ بقر۔۷)

جو کافر ہوں۔ برابر ہے اُن کے لیئے۔ تو ڈراے یا نہ ڈراے۔ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ مُہر کر دی اللہ نے اُن کے دلوں پر اور کان پر اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے

تفسیر جلالین میں "جو کافر ہوتے" کے بعد تحریر ہے۔

جیسے ابوجہل اور ابولہب اور جن کی قسمت میں کافر ہونا لکھا گیا۔

اگر کافر ہونا قسمت میں لکھا گیا ہے۔ اور وہ اٹل ہے۔ تو کسی بھی اخلاق کی رُو سے ان کافروں کو مجرم نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر عذاب بھی اسی طرح پہلے سے لکھا گیا ہے۔ تو وہ کسی ضابطہ کے مطابق سزا نہ ہوگا۔ ہاں! قادر کی بے ضابطہ قدرت کا ثبوت بھلے ہی ہو جائے۔

پھر فرمایا ہے۔

فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ج (بقر۔۱۰)

اُن کے دِلوں میں بیماری ہے۔ پس بڑھا دی اللہ نے اُن کی بیماری۔

یہ بیماری وُہی ہے جس کا ذکر ہوا۔ کہ اُن کی قسمت میں کافر ہونا تھا۔ تفسیر جلالین میں لکھا ہے۔

اللہ نے اُن کی بیماری کو بڑھایا۔ اس طرح کہ جو احکام اللہ نے اُتارے۔ اُن سے منکر ہوتے۔

یہ ہوا کُفر پر کُفر اور یہ سب اللہ کے حکم سے۔ موضح القرآن میں ان آزاروں کی اور تشریح کی ہے۔ وہ یہ کہ :-

ایک آزار یہ تھا۔ کہ جس دین کو دل نہ چاہتا تھا۔ قبول کرنا پڑا۔
دوسرا آزار اللہ نے دیا۔ کہ حکم کیا جہاد کا۔ جن کے خیر خواہ تھے
ان سے لڑنا پڑا۔

حلقہ اسلام میں ابتدائی بھرتی کس طرح ہوئی؟ اس پر ان بزرگ
کی رائے قابل غور ہے۔ اول اسلام کا قبول بالجبر۔ پھر جہاد میں شمولیت
بالجبر۔ اور یہ دونوں اللہ کے حکم سے! تقدیر!

سورہ بقر میں کہا ہے۔

وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (بقر۔ ۸۶)

اللہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت سے جس کو چاہتا ہے۔

اس پر تفسیر حسینی کا حاشیہ ہے۔ کہ

اختصاص مے دہد بہ نبوت و وحی خود ہر کرا خواہد۔

خاص کرتا ہے نبوت اور وحی کے لئے جس کو چاہتا ہے۔

وجہ؟ زمانہ حال کے بعض علما سوامی دیانند کے اعتراض کی معقولیت
کے آگے خمیدہ سر ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ

جس شخص کو خدا نبی کرتا ہے۔ اس کے حال سے خوب واقف ہوتا
ہے۔

حضرت! یہ حال کس کا بنایا ہوا ہے؟ اللہ میاں کا یا مختص ہونے
والے شخص کا اپنا؟ نبوت کے لئے اختصاص عدم سے وجود میں
لانے سے پیشتر ہوتا ہے۔ یا بعد؟ پیشتر ہوتا ہے۔ تو مختص ہونے
والے کے خود مختارانہ عمل پر کچھ موقوف نہ ہوا۔ اللہ کی مرضی پر موقوف

ہوا۔ تو اختصاص کا انحصار اللہ ہی کی مرضی پر ہوا۔ کسی کی اپنی صلاحیت پر نہ ہوا۔

یہی نہیں۔ پھر فرمایا ہے۔

اللہَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِہٖ مَنْ یَّشَاءُ (آل عمران - ۱۷۳)

اللہ پسند کرتا ہے اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہتا ہے۔

سورہ بقر میں آیا ہے۔

وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (آیت ۱۳۱)

اور تحقیق ہم نے پسند کیا اس کو دنیا میں۔ اور تحقیق وہ آخرت میں نیکوں میں ہے۔

مولوی ثناء اللہ صاحب آخرت میں نیکوں میں ہونا ہی ابراہیم کے "چنے جانے کی وجہ" قرار دیتے ہیں۔ اور سوامی دیانند کے اس قول پر صاد فرماتے ہیں۔ کہ جو "دھرماتما ہے وہی خدا کو عزیز ہے"۔ اب سوال یہ ہوگا۔ کہ آیا نیکی یا بدی اپنی خود مختارانہ سعی سے ہوتی ہے یا جیسے تفسیر حسینی کے مصنف کا یقین ہے۔ خدا پہلے سے کسی کو نیک اور کسی کو بد مقرر کر دیتا ہے؟ اگر ہر انسان کا ملکہ برابر ہے۔ تو کیا دوسرے "دھرماتما" بھی پیغمبر ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہر "دھرماتما" اتنا نیک ہو سکتا ہے۔ جتنا ابراہیم۔ تو اُسے پیغمبر بھی ہو سکنا چاہیئے۔ اگر دوسروں میں اتنا نیک ہونے کی صلاحیت نہیں۔ تو اللہ میاں کی بے انصافی ہے اور اگر صلاحیت ہوتے ہوتے بھی نبوت کے شرف سے محروم ہے۔ تو اس سے بھی بڑھ کر بے انصافی ہے۔ بے انصافی نہیں ظلم ہے۔

اللہ فرماتا ہے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝ (بقر - ۲۴۸)

ان میں سے کوئی ایمان لایا - اور کوئی کافر ہوا - اگر اللہ چاہتا نہ لڑتے - لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے -

یہ لڑانے کی خواہش خوب ہے !

تفسیر جلالین میں اسی مقام پر کہا ہے -

جس کو چاہے - بھلے کاموں کی توفیق دے - اور جس کو چاہے - رسوا کرے - توفیق نہ دے -

آگے فرمایا ہے -

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ (بقر - ۲۶۴)

دیتا ہے حکمت جسے چاہتا ہے -

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (بقر - ۲۸۰)

پھر بخشیگا جس کو چاہے اور عذاب دے گا جسے چاہیگا - اور اللہ سب باتوں پر قادر ہے -

یہ بات ہے تو اعمال کا جھگڑا کاہے کو پیدا کیا ہے ؟

سورہ رعد میں ہے -

اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝

(سورہ رعد - ۲۶)

تحقیق اللہ گمراہ کرتا ہے - جسے چاہتا ہے - اور راہ دکھاتا ہے -

اپنی طرف جو رجوع کرتا ہے۔

اِس پر موضح القرآن میں تحریر ہے۔کہ

یہی منظور ہے۔کوئی بہکے اور کوئی راہ پائے۔سو جس کو دل میں رجوع آئی۔ نشان ہے۔کہ اس کو سمجھانا چاہا۔

مطلب یہ ہے کہ گمراہ ہونا یا سیدھے راستے پر آنا اپنی کوشش سے نہیں۔ اللہ میاں کی مرضی سے ہے۔تو سزا جزا کا مستحق کون ہوا؟ اور اس قول کے کیا معنی؟

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ (سورہ ہود ۔ آیت ۷)

آزمائے تم کو کون بہتر ہے تم میں سے عمل میں۔

اعمال بھی خود مقرر کرتے ہو۔ پھر آزمائش بھی کرتے ہو۔کیا شک ہے کہ تقدیر کے مطابق عمل نہ ہوگا؟

سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۔ ۱۲)

اور ہر آدمی کے لئے لٹکا دیا ہم نے اعمال نامہ اس کا بیچ گردن اس کی کے ۔ اور نکالیں گے واسطے اس کے دن قیامت کے ایک کتاب کہ دیکھیگا اس کو کھلی ہوئی۔

اس آیت کی تشریح میں تفسیر جلالین میں درج ہے۔کہ مجاہد نے کہا۔کہ نہیں کوئی بچہ مگر اس کی گردن میں ایک کاغذ ہوتا ہے۔کہ اس میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔کہ یہ نیک بخت ہے یا بدبخت؟ یہی قول حسینی میں نقل کرکے آگے لکھا ہے۔

یعنی آنچہ تقدیر کردہ اند از روز ازل از کردار او - لازم ساختہ ایم در گردنِ او - یعنی او را چارہ نیست ازاں -

یعنی جو کچھ تقدیر کیا ہے روز ازل سے اس کے اعمال سے - ہم نے لازم کیا ہے اُس کی گردن میں - یعنی اُس کو اس سے چارہ نہیں- لیجئے - ہمارے عمل تو پہلے سے ہی مقدر ہو چکے - ہماری نیک بختی یا بدبختی ہمارے وجود میں آنے سے پیشتر قرار پا چکی - اب ہمیں اِس تقدیر یا اعمال نامے کے مطابق عمل کر دینا ہے - عمل میں اختیار کہاں رہا؟ اور اختیار نہیں - تو سزا جزا کیسی ؟

خود قرآن فرماتا ہے -

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝ (سورہ سجدہ ۱۲)

اور اگر ہم چاہتے - دیتے ہر شخص کو ہدایت - لیکن سچا ہے حکم میرا کہ البتہ بھرونگا دوزخ کو - جنوں اور انسانوں سے اکٹھا -

تفسیر حسینی میں اس کا ترجمہ یوں کیا ہے -

واگر مے خواستیم ہر آئینہ دادیم در دُنیا ہر نفس را آنچہ راہ یافتی آں بہ سُوئے ایمان و عمل صالح - و لیکن ثابت شدہ است ایں حکم من کہ ہر آئینہ پُر سازم دوزخ را از کفار و دیو و آدمی ہمراہشاں -

اِس ترجمہ میں دوزخ کی بھرتی میں کفار کا ایزاد حسینی کی اپنی ایجاد ہے اس پر کسی کا فر کو حرف ہو سکتا ہے - لیکن یہ بات تو قرآن کے اپنے لفظوں میں درج ہے - کہ اللہ ہدایت ہر ایک کو کر سکتا تھا - لیکن نہیں کرتا - اس لئے کہ اُس نے دوزخ بھی بنایا ہے - اور اسے بھرنا ہے -

اِس قول کے بعد جہاں جہاں یہ ذکر ہے۔ کہ اللہ گنہ گاروں کو ہدایت نہیں کرتا۔ یا قرآن فقط پرہیزگاروں کو راستہ دکھلانے کے لئے ہے۔ جیسے بقر۔۲ میں۔ وہاں اس قول کے معنی یہی کرنے ہونگے۔ کہ گنہگار اور پرہیزگار پہلے سے مخصوص ہیں۔ اور سوامی دیانند کا یہ اعتراض۔ کہ پرہیزگار تو سیدھے راستے پر ہیں ہی۔ اور گنہگاروں کے لئے ہدایت نہیں۔ تو نزول قرآن کا فائدہ کیسے ہے؟ لاجواب اعتراض ہے۔ قرآن نہ ہوتا۔ تو بھی پرہیزگار پرہیزگاری کے لئے مخصوص تھے۔ اور گنہگار گنہگاری کے لئے۔

یہ ہوئی تقدیر اعمال کی۔ کہ ہمارے لئے بھلے اور بُرے فعل پہلے سے مقرر ہیں۔ اور ہم نوشتہ تقدیر کو پورا کرتے ہیں۔ دوسری تقدیر ہماری رنج و راحت کی ہے۔ کوئی پیدا ہوتے ہی دُکھی ہے۔ کوئی پیدا ہوتے ہی سُکھی۔ یہ فرق کیوں؟ آریہ سماج کے عقائد کے مطابق سُکھ۔ دُکھ۔ اعمال کی سزا جزا ہے۔ مگر جو لوگ اس زندگی سے پیشتر کسی زندگی کے ہی قائل نہیں۔ وہ موجودہ زندگی کے شروع ہوتے ہی مختلف اشخاص کے لئے رنج و راحت کے اختلاف اور درجات کی غیر مساوات کا کیا باعث قرار دے سکتے ہیں؟ موجودہ زندگی کے اعمال کی سزا جزا اُنھوں نے دوزخ اور بہشت کو تجویز کیا ہے۔ اگرچہ متذکرہ بالا مسئلہ تقدیر نے سزا جزا کا مسئلہ ہی بے بنیاد بنا دیا ہے۔ تاہم تھوڑی دیر کے لئے اس مشکل سے قطع نظر بھی کر لو۔ تو موجودہ غیر مساوات کا فلسفیانہ حل کیا ہے؟ آخرت کے سُکھ اور دُکھ کی وجہ موجودہ اعمال تبھی ہو سکتے ہیں جب موجودہ زندگی کے سُکھ اور دُکھ اس سے پیشتر کئے گئے اعمال کا پھل

ہوں۔ ورنہ اعمال اور سُکھ دُکھ میں علت و معلول کا تعلق ہی نہ ہوگا۔ اگر اِس دُنیا میں سکھ دُکھ بغیر پیشتر کے اعمال کے دیئے جاتے ہیں۔ تو آخرت کے بہشت و دوزخ بھی بغیر اعمال کے کیوں نہ ملیں گے؟ تقدیر کے متعلق جو بحث ہم نے اوپر کی ہے۔ اس سے صاف ثابت ہے۔ کہ اسلام کی رُو سے اعمال فقط دل بہلانے کی چیز ہیں۔ ان میں ہماری خود مختارانہ مرضی کو جگہ ہی نہیں۔ ہم بھلا کرنے پہ بھی مجبور ہیں۔ اور بُرا کرنے پر بھی۔ پھر بہشت اور دوزخ میں جانے پر بھی ویسے ہی مجبور ہیں۔ اللہ میاں کا ازلی قول ہے۔ کہ دوزخ بھرا جائیگا۔ اور وہ پورا ہونا ہے۔ ہماری سعادتمندی اسی میں ہے۔ کہ اس قول کو پورا کریں۔ بھلا اس سے بڑھ کر اسلام کیا ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ کا ازلی قول ہمارے اعمال کے طفیل سچا ثابت ہو؟ پھر اعمال بخشے بھی جا سکتے ہیں۔ اللہ جسے چاہے۔ بغیر اعمال کے بہشت میں لے جائے۔ چنانچہ مولوی ثناء اللہ لکھتے ہیں۔

> بیچارے نابالغ بچوں کو تو اس امر کی خبر بھی نہیں۔ کہ شرک کفر کیا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ جنت میں جانے سے روکے نہ جائینگے۔
>
> حق پرکاش۔ صفحہ ۲۲۷۔ ۲۲۸

یہی عقیدہ اسلام کا ہے۔ اب تو اور بھی اعمال سے چھٹی ہوئی۔ مولانا ثناء اللہ کے ہم مشرب لوگ اگر یہ خواہش کریں۔ اور اس خواہش پر عمل پیرا بھی ہو جائیں۔ کہ ہر بچہ بغیر شرک کفر کی تمیز کئے مر جایا کرے۔ تو اللہ میاں کا یہ قول کہ دوزخ بھرنا ہے۔ شاید پورا ہونے سے رہ جائے۔ تبلیغ کا یہ نرالا ڈھنگ خوب ہے۔ مگر نہیں مولانا مسلمان ہیں۔

اور انہیں اللہ میاں کا حکم پُورا کرنا ہے - جزاک اللہ -
خیر- اب ہم قرآن کریم کے ان اقوال کا تبصرہ کریں گے - جن میں اس دُنیا کی دولت تقدیر کے ہاتھوں بغیر اعمال کی یا کسی اور چیز کی شرط کے انزال کی ہے - فرمایا ہے -

اللّٰہ یرزق من یشاءُ بغیرِ حساب (بقر - ۲۰۹)

اللہ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے -

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیَقْدِرُ - (رعد - ۲۲)

اللہ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے - اور تنگ کرتا ہے -

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ... ... (شعرا - ۷۶ - ۸۰)

جس نے پیدا کیا مجھ کو - پس وہی راہ دکھلاتا ہے - اور جو کھلاتا ہے مجھ کو - اور پلاتا ہے مجھ کو -

جب کھلانا اور پلانا بیشتر کے اعمال کا نتیجہ نہیں - تو اس میں مساوات کیوں نہیں ؟ ہماری غریبی اور ہماری امیری اللہ کی دین ہے پھر چونکہ ہمارے اعمال بھی روزِ ازل سے مقرر ہو کر ہماری گردن میں باندھ دیئے گئے ہیں - اس لئے کھانے پینے میں بے اعتدالی کی ذمہ داری بھی ہم پر نہیں آتی - اور اس کا نتیجہ جو بیماری ہو جاتی ہے - اس کے جوابدہ بوجہ مجبوری کے ہم نہیں - اللہ کی غیر مشروط بخشش کے معنے تو یہ ہیں - کہ بیرا بخشنا - اور اگر دُنیا میں رنگا رنگی لانے کے لئے غیر مساوات ضروری تھی - تو وہ غیر مساوات بغیر ہمیں تکلیف دینے کے بھی

تو ہو سکتی تھی۔ غیر مساوات فقط راحتوں کی ہو جاتی۔ ہمارے کھانے پینے
میں بیماری پیدا کرنے کی صفت ہی نہ رکھتا۔ بغیر پر دو جنم کو ماننے ہماری
بیماری ہمارے پرانے افعال کی سزا تو ہو نہیں سکتی۔ اور موجودہ زندگی
کے اعمال میں بھی ہم تقدیر کے آگے سر تسلیم خم ہیں۔ تو کیا بیماری بھی اللہ
میاں کی دین سمجھی جائے؟ یہ دین اس کی شان رحمانیت کے عین شایاں
ہے!

زندگی کی ایک نعمت ہے۔ لڑکے۔ لڑکیاں۔ اس پر فرمایا ہے۔
يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ
ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَشَاءُ عَقِيمًا ۝ (شوریٰ - ۴۹)

دیتا ہے جسے چاہتا ہے بیٹیاں۔ اور دیتا ہے جسے چاہتا ہے بیٹے۔ اور
اکٹھے دیتا ہے۔ ان کو بیٹے اور بیٹیاں۔ اور کرتا ہے جسے چاہے۔ بے
فرزند۔

اس آیت پر بھی سوال وہی ہے۔ کہ جب حیوانات میں مجامعت کا
ثمر اکثر اولاد ہوتی ہے۔ تو انسانوں کی اکثر مجامعت بے اثر کیوں رہے؟
کیا اولاد ہونے نہ ہونے میں کوئی قانون کام کرتا ہے؟ یا محض بے ضابطگی ہے؟
اسی طرح لڑکا یا لڑکی پیدا ہونے میں بھی کوئی قاعدہ ہے یا محض بے
قاعدگی ہے؟ ہماری محرومی کی وجہ یا تو ہمارا خلاف قانون عمل ہو سکتا ہے
یا گذشتہ زندگی کی بد اعمالی۔ جس کی سزا کے طور پر ہمیں بے اولاد کیا جاتا
ہے۔ اسلام میں گذشتہ زندگی کا عقیدہ نہیں۔ اور موجودہ زندگی کے
اعمال میں انسان کے عدم اختیار کی وجہ سے ثمر پیدا کرنے کی طاقت نہیں
سب اللہ پر موقوف ہے۔ اس پر سوال اٹھتا ہے۔ کہ آخر بغیر کسی عمل

کے ہی اولاد کیوں نہیں پیدا کر دیتا؟ مولانا ثناء اللہ اس سوال پر بگڑ رہے ہیں۔ پوچھتے ہیں۔ کیا یہ کسی آستک (خدا کے قائل) کا سوال ہے؟ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے متعلق اپنے عقیدے پر غور فرما لیں۔ اگر وہ عقیدہ آستکوں کا ہے۔ تو سوال آستکوں کا کیوں نہیں؟ سوامی دیانند کو اعتراض ہے اسلام کے مسئلہ تقدیر پر۔ جس کے مطابق اللہ میاں ہی فاعل حقیقی ہے۔ اور ہم سب کٹھ پتلیاں۔ اس صورت میں اولاد کی پیدائش پر والدین کی طرف سے کسی عمل کی قید مناسب نہیں۔ ایک طرف تقدیر۔ دوسری طرف قانون متضاد عقائد ہیں۔ اور تو اور بخاری میں 'عزل' کی اجازت اسی بنا پر دی ہے۔ کہ اولاد والدین کے عمل کا نتیجہ ہی نہیں۔ محض اللہ کی دین ہے۔

درحقیقت انسان کا نہ فقط سزا و جزا کے بھگتنے کے لئے بلکہ ان کے لئے مطابق و غیر مطابق اعمال کرنے کے لئے بھی مجبور ہونا منطقی نتیجہ ہے اس مسلمہ کا کہ اللہ ازلی ہے۔ اور باقی سب موجودات عدم سے وجود میں لائے گئے ہیں۔ عدم سے وجود میں لائے ہوئے موجودات کی اپنی قائم بالذات ہستی ہو ہی نہیں سکتی۔ ذوق نے کہا ہی تو ہے۔

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

نیک بد نہیں ہو سکتا۔ بد نیک نہیں ہو سکتا۔ جیسا بنانے والے نے بنا دیا۔ بن گئے۔ پھر سزا جزا کیسی؟ نیستی سے ہستی کے مسئلے پر ہم ایک جدا باب لکھیں گے۔ فی الحال اس مضمون کے ایک دو حوالجات عرض کیئے دیتے ہیں۔

کہا ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ط (سورہ القصص - ۶۸)

اور رب تیرا پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے -

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ٥ (سورہ بقر - ۱۱۸)

پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا - جب وہ چاہتا ہے کرنا کوئی کام - سوا اس کے نہیں کہ کہے ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے -

جب یہ سب کائنات اللہ کے ایک حکم کا نتیجہ ہے - اس حکم سے پہلے اِس کائنات کا عدم محض تھا - تو اس کی عِلّت فقط اللہ تعالیٰ کا حکم ہی تو ہوا - اِس صورت میں اس کائنات کا حُسن اور قبح اللہ تعالےٰ کے حکم کا حسن اور قبح ہے - ہم سُکھ اور دُکھ بھوگنے میں مجبور ہیں - بھلے بُرے عمل کرنے میں مجبور ہیں - اور بالآخر دوزخ اور بہشت میں جانے پر بھی مجبور ہیں - اللہ کو دوزخ اور جنت بھرنے ہیں - اپنی مرضی سے پیغمبر بناتے ہیں - ان میں سے انتخاب کرتا ہے - اور اس میں اصول ہے اس کی بلے شرط، بے روک ٹوک مرضی کا - پھر ہدایت کیا اور نصیحت کے کیا معنی؟ سب کھیل ہی تو ہے - اللہ قادر سہی - پر ہماری ذمہ داری کچھ نہیں اس ایک مسئلہ سے اخلاق - فلسفہ - قانون سب بے بنیاد ہو کر رہ جاتے ہیں -

تقدیر کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ کی مطلق قدرت کا اطلاق - یعنی اس قُدرت کا جس پر کوئی بندش نہیں - سوال ہوتا ہے - کہ کیا اللہ گناہ کر سکتا ہے؟ یعنی کوئی ایسا فعل جو انسان کرے تو گناہ کہلائے - نہ کر سکے تو قادر مطلق نہ ہو - جبھی تو لکھا ہے -

وَمَکَرُوْ وَمَکَرَاللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ ٥ (آل عمران - ۵۰)

مکر کیا اور مکر کیا اللہ نے ۔ اور اللہ بڑا مکر کرنے والا ہے ۔

اس آیت کی کیفیت تفسیر حسینی میں یوں بیان کی ہے ۔

بانواع حیل عیسیٰ را بدست آوردند ودر خانہ محبوس ساختند ..... ۔ ..

علی الصباح مہتر خود کہ یہودا نام داشت ۔ بدروں خانہ فرستادند .. ..

حق تعالیٰ در آں شب عیسیٰ را بر آسمان بُردہ بود ۔ ۔ .. یہودا .. ..

عیسیٰ را ندید و حق تعالیٰ شبیہ عیسیٰ بر د فگند .. .. داز دارش در آویختہ تیر باراں نمودند ۔

طرح طرح کے بہانوں سے عیسیٰ کو پکڑا اور کمرے میں قید کیا .. ..

صبح اپنے میں سے بزرگ کو جس کا نام یہودا تھا ۔ کمرے کے اندر بھیجا ۔ .. .. اللہ تعالیٰ نے رات رات میں عیسیٰ کو آسمان پر اُٹھا لیا تھا ۔ .. یہودا نے .. .. عیسیٰ کو نہ پایا ۔ اور اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کی شکل اُسے دے دی .. .. اُسے صلیب پر لٹکا کر اس پر تیر برسائے گئے ۔

یہودا کو عیسیٰ کی شکل میں ظاہر کر کے اُسے مروانا فریب ہی تو ہے

یہی مطلب مندرجہ ذیل آیات کا ہے ۔

یَمْکُرُ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ (انفال - ۲۹)

مکر کرتا تھا اللہ اور اللہ اعلیٰ مکر کرنے والا ہے ۔

اِنَّھُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا وَّاَکِیْدُ کَیْدًا (طارق ۱۶)

تحقیق وہ مکر کرتے ہیں ایک مکر ۔ اور میں مکر کرتا ہوں ایک مکر

یہی سلوک فرشتوں سے ہوا تھا ۔ کہ انہیں تو نام سکھائے نہیں آدم

کو سکھا دیئیے۔ پھر ان کا مقابلہ کرا دیا۔ آدم زیادہ عالم نکلا۔ جب اللہ نے خود اُسے زیادہ علم دیا۔ تو اس میں آدم کی فضیلت کیا ہوئی؟ فرشتوں کو سکھا دیتا۔ تو وہ فاضل ہو جاتے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔۔ ۔۔ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بقر۔ ۳۴)

اور سکھائے آدم کو سارے نام۔ پھر کیا سامنے فرشتوں کے۔ پھر کہا۔ مجھے ان کے نام بتاؤ۔ اگر سچے ہو۔ کہا۔ اے آدم بتا دے ان کے نام۔ پس جب بتا دیئے ان کے نام۔ تو کہا۔ کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا۔ کہ تحقیق میں جانتا ہوں چھپی باتیں۔ زمین اور آسمانوں کی؟

اسی طرح کے مندرجہ ذیل اقوال ہیں۔

فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۔ (توبہ۔ ۷۵)

پس ٹھٹھا کرتے ہیں ان پر۔ پس ٹھٹھا کرتا ہے اللہ ان سے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۔ (نسا ۱۳۹)

تحقیق منافق فریب دیتے ہیں اللہ کو اور وہ فریب دیتا ہے ان کو

اللہ کے فریب میں آجانے کی انتہا یہ ہے۔ کہ جواباً فریب کرنے لگے۔ جیسے عیسیٰ کی حدیث میں اوپر بیان ہوا۔

سورہ بقر میں آیا ہے

اللّٰهُ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (بقر۔ ۹۸)

اللہ دشمن ہے کافروں کا۔

لیجئے۔ اب عداوت بھی کرنے لگے۔ ایک کافر بنانا۔ پھر دشمنی پر تُل جانا۔

سورہ نساء میں لکھا ہے۔

وَاللّٰہُ اَرْکَسَھُمْ بِمَا کَسَبُوْا اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَھْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِیْلًا ۝

(سورہ نسا۔ رکوع ۱۲۔ آیت ۸۷)

اور اللہ نے اُلٹا کیا اُنہیں ساتھ اُس کے جو اُنہوں نے کیا۔ کیا تم چاہتے ہو۔ کہ راہ پر لاؤ اُس کو جسے گمراہ کیا اللہ نے۔ اور جسے گمراہ کیا اللہ نے۔ ہرگز نہ پائیگا۔ تُو واسطے اُس کے راستہ۔

اس کی کیفیت تفسیر جلالین میں یوں بیان کی ہے۔

جنگ احد سے ایک فرقہ منافقین کا بھاگ گیا تھا۔ مسلمان متردد تھے۔ یعنی اہل اسلام کو فکر ہوا۔ کہ انہیں پھر اسلام میں لائیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے کہا۔ کہ انہیں گمراہ ہی ہم نے کیا ہے۔ تم انہیں راستہ نہیں دکھا سکتے۔ کاش! اہل اسلام تقدیر کے اس کرشمہ کے قائل ہوتے اور شُدھی کو اللہ کی مرضی مان کر اس کے خلاف شور نہ مچاتے۔

قرآن خود فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا ۝

(سورہ نسا۔ ع ۱۹۔ آیۃ ۱۳۶)

تحقیق جو ایمان لائے۔ پھر کافر ہوئے۔ پھر ایمان لائے۔ پھر کافر ہوئے۔

پھر زیادتی کی کفر میں۔ نہیں اللہ معاف کرتا اُن کو اور نہیں دکھاتا راستہ

اِس آیت کی تفسیر حسینی میں یوں توضیح کی ہے۔

تحقیق لوگ جو ایمان لائے موسیٰ علیہ السلام پر یعنی یہود۔ پھر کافر ہو گئے۔ گوسالہ پوجنے کے سبب سے۔ پھر ایمان لائے اور توبہ کی۔ پھر کافر ہو گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں .. .. .. پھر زیادہ کیا اُنہوں نے کفر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار کر کے .. .. .. نہیں اللہ کہ بخش دے اُنہیں .. .. .. حق تعالےٰ نے جان لیا ہے۔ کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہے۔

مطلب یہ کہ جن کے بزرگ حضرت موسیٰ پر ایمان لا کر پھر اُن سے اور اُن کے بعد حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد سے مُنکر رہے۔ ان کے لئے نہ اسلام ہے نہ نجات۔ ہم حیران ہیں۔ کہ یہ اہلِ اسلام تبلیغ اسلام کی سعی لاحاصل کیوں کرتے ہیں ؟

تقدیر کے مسئلے کی خوبی یہ ہے۔ کہ انسان تو اس سے بندھ گئے ہیں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ قانون کے ساتھ نہیں۔ اللہ میاں کی بے ضابطہ اور بے قانون مرضی کے ساتھ۔ مگر اللہ میاں خود آزاد ہے۔ کسی ضابطہ اخلاق و منطق کا پابند نہیں۔

کُن فیکون انسان اور شیطان

فلسفے اور مذہب کے سامنے ایک سوال ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ وہ یہ کہ موجودات کی پیدائش کیسے ہوئی؟ تمام مذاہب، جو پرماتما کی ہستی کے قائل ہیں۔ پرماتما کا وجود ازلی مانتے ہیں۔ اس کی ابتدا کبھی نہیں ہوئی۔ آریہ سماج غیر اللہ کا وجود بھی انادی یعنی ازلی تسلیم کرتا ہے لیکن اسلام کا عقیدہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام میں مادی اشیا۔ اور ذی العقول موجودات کو ابدی تو مانا ہے۔ لیکن ازلی نہیں۔ اسلام کا عقیدہ ہے۔ کہ پرماتما نے کہا۔ 'کُن' اور سب کچھ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ سورہ بقر میں آیا ہے۔

بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۝ (بقر۔۱۱۸)

بنانے والا آسمانوں اور زمین کا۔ اور جب چاہتا ہے کرنا کوئی کام۔ سوائے اس کے نہیں کہ اُس کو کہے۔ ہو جا۔ بس وہ ہو جاتا ہے۔

آیت میں لکھا ہے "اُس کو کہتا ہے۔ ہو جا۔ کس کو کہتا ہے؟ غیر موجود کو؟ یہ 'ہو جا' زمانہ ماضی میں ہی ہو لیا۔ یا اب بھی یہ حکم دیا جاتا ہے طرزِ بیان سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ حکم ہمیشہ دیا جاتا ہے۔ مگر کیا موجودہ

زمانے میں کوئی چیز فقط اس حکم کو علّت بنا کر معلول ہوتی ہے ؟ اب نہیں ہوتی۔ تو پہلے بھی کیونکر ہوتی ہوگی ؟ حکم دیگر علت کی موجودگی میں دیا جاتا تو قرین قیاس ہے۔ اس کے برعکس نہیں۔ بے علت معلول کے لئے ثبوت چاہیئے۔

فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْن ۔ (آل عمران ۴۷)

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ٥ (نحل ۴۰)

نہیں قول ہمارا کسی شے کو جب ہم ارادہ کرتے ہیں اس کو سوائے اس کے کہ ہم اُسے کہیں ہو جا۔ پس وہ ہو جاتی ہے۔

اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ٥ (یٰس ۸۰)

سوا اس کے نہیں حکم اس کا جب چاہے کوئی چیز۔ یہ کہتا ہے اس کو ہو جا۔ پس ہو جاتی ہے۔

اس کے برخلاف مندرجہ ذیل آیات میں کچھ اور کیفیت ہے۔

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ج (مائدہ ۵۲ - یونس ۳)

تحقیق رب تمہارا اللہ ہے جس نے بنایا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں۔ پھر قرار پکڑا اُوپر عرش کے۔

کوئی سوال کر سکتا ہے۔ کہ اس وقت سورج تو تھا نہیں۔ پھر دنوں کا اندازہ کیسے ہوا ؟ تفسیر جلالین میں اس کا جواب دیا ہے۔

مراد چھ دن سے اس قدر مقدار ہے۔ کیونکہ اس وقت سورج نہ تھا۔ جو ان کا حساب اس سے ہوتا۔

کوئی پوچھے چھ دن کیوں لگا دیئے ؟ لکھا ہے۔

اور وجہ اس کی کہ چھ دن میں بنایا حالانکہ اللہ کو قدرت تھی۔ کہ اگر چاہتا ایک لحظہ میں بنا ڈالتا۔ یہ ہے کہ آہستگی اور جلدی نہ کرنا سکھلائے۔

تفسیر حسینی میں کہا ہے۔

مکر شیطانست تعجیل درشتاب   خوئے رحمان ست صبر و حساب

شیطان کی عادت ہے جلدی   رحمٰن کی عادت ہے صبر و حساب

تو یہ کُن بھی جلدی نہ کہا جاتا ہوگا۔ صبر اور حساب سے کہا جاتا ہوگا یعنی چھ دن میں۔

سورہ حم سجدہ میں فرمایا ہے۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِىْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِىْ يَوْمَيْنِ ۔ ۔ ۔ وَقَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا فِىْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۔ ۔ ۔ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِىْ يَوْمَيْنِ ۔ (حم سجدہ - ۹ - ۱۰ - ۱۲)

کہ۔ کیا تم کفر کرتے ہو اس سے جس نے بنایا زمین کو دو دن میں ۔ ۔ ۔ اور مقرر کیں اس میں خوراکیں چار دن میں ۔ ۔ ۔

پھر بنائے سات آسمان دو دن میں۔

لیجئے۔ اب تو دنوں کی تعداد آٹھ ہو گئی۔ تفسیر جلالین میں اس مشکل کا حل کیا ہے

زمین دو روز اتوار اور سوموار کو بنائی گئی۔ مافیہا منگل اور بدھ میں۔ اور آسمان جمعرات اور جمعہ۔ اور جمعہ کی پچھلی رات میں فراغت ہوئی۔ اور اسی وقت بنایا گیا آدم کو۔

خوراکیں جو چار دن میں پیدا کی تھیں۔ ان کے دو دن زمین کی پیدائش

میں شمار کر لئے۔ اور اس طرح کل تعداد پھر چھ کی چھ رہی۔
یہ ہوئی غیر ذی العقول کی پیدائش۔ اب انسان کی بھی سُن لیجئے۔
یہ تو تفسیر جلالین نے ہی بتا دیا۔ کہ جمعہ کی پچھلی رات آدم کا پُتلا گھڑا
گیا تھا۔ گھڑا کس سے گیا؟ کیسے گیا؟

خَلَقتَہٗ مِن طِین۔ (ص)

پیدا کیا اس کو مٹی سے۔

خَلَقتُ بِیَدَیَّ۔ (ص)

بنایا میں نے دونو ہاتھوں سے

فَاِذَا سَوَّیتُہٗ وَنَفَختُ فِیہِ مِن رُّوحِی۔ (حجر-۲۷)

جب میں درست کر لوں اس کو اور پھونک دوں اس میں
رُوح اپنی۔

ان حوالجات سے ثابت ہے۔ کہ انسان کی علتِ مادی مٹی ہے۔
بعض مقامات پر گندی مٹی کہا ہے۔ اسے اللہ نے دونوں ہاتھوں سے
درست کیا ہے۔ اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے۔ کیا واقعی انسانی جسم
کی ترکیب مٹی ہی سے ہوئی ہے؟ کیا اس کو بنانے والا دو ہاتھوں والا
ہے؟ یہ سوال ہمارے اس باب کے موضوع سے باہر ہیں۔ یہاں فقط یہ
دیکھنا مطلوب ہے۔ کہ انسان کی اپنی قائم بالذات ہستی کوئی نہیں مٹی
وہ ہے جو "کن" کے کہنے ہی زمین کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ چاہے وہ
"کن" ایک لمحہ میں کہا گیا ہو۔ چاہے دو دن یا چھ دن میں۔ رُوح اللہ میاں
کی اپنی ہے۔ اس کے معنی خواہ یہ کرو۔ کہ اللہ نے اپنے میں سے انسان
کے قالب میں زندگی کا سانس پھونکا۔ جیسا انجیل میں بیان کیا گیا ہے اور

چاہیے سوامی دیانند کے اعتراض کی معقولیت کے آگے سر تسلیم خم کر لو۔ اور "روحی" کے معنی کرو۔ "اللہ میاں کی پیاری رُوح" روح بہر حال یا تو اللہ میاں کے اندر سے نکلی ہے۔ یا نیستی سے ہست کی گئی۔ اس طرح کی مٹی اور روح فعل میں مختار نہیں ہو سکتی۔ جو صفات اور عادات فاعل حقیقی نے اس میں مرکوز کر دیں۔ ان کے مطابق وہ فعل کرتی جائیگی۔
پھر اللہ میاں کا یہ شکوہ کہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (ابراہیم - ۲۷)

تحقیق انسان ظالم ہے اور کافر۔

بیجا ہے۔ کیونکہ یہ کفر اور ظلم انسان کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا ہے اچنبھا تو یہ ہے۔ کہ بعض انسان اس جبلی ملکہ کے خلاف انصاف اور ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر وہ بھی تو اُن کی کرامات نہیں۔ بنانے والے نے ایسا بنا دیا۔

پیدائش کے اس عقیدے پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے۔ کہ جب ازلی موجود سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور کوئی نہیں۔ اور اللہ کامل ہے پاک ہے۔ نیک ہے۔ تو اس کی پیدائش میں نقص۔ گناہ۔ کمزوری کیسے دخل پا گئی ہے؟
گناہ کا منبع کون ہے؟ قرآن شریف میں اس سوال کو یوں حل فرمایا ہے:-

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (سورہ بقر - ۳۶)

اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو۔ سجدہ کرو آدم کو۔ پس سجدہ کیا اُنہوں

نے سوائے شیطان کے ۔ اس نے تکبر کیا ۔ اور تحقیق وہ تھا کافروں
میں سے ۔
سوال یہ ہے ۔ کہ جب شیطان اللہ کا مخلوق ہے ۔ اور اللہ اُسے جیسا
چاہتا ۔ بنا سکتا تھا ۔ تو اُسے کافر کیوں بنایا ؟
لیجئے ۔ گناہ کا قصہ آگے چلتا ہے ۔
وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا
رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ
الظّٰلِمِينَ ○ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ
وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ
مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلٰى حِينٍ ○ (بقر ۳۸)
اور کہا ہم نے ۔ اے آدم ۔ رہو تم اور تمہاری عورت جنّت میں ۔
اور کھاؤ اس میں حسب مرضی ۔ جیسا چاہو ۔ اور نہ نزدیک جاؤ
اس درخت کے ۔ گناہگار ہو جاؤ گے ۔ پس گمراہ کیا ان کو شیطان
نے اور نکال دیا اس سے جس میں تھے ۔ اور کہا ہم نے اُترو ۔ تم
میں سے بعض بعض کے دشمن ہیں ۔ اور تمہارے لئے زمین پر ٹھکانہ
ہے ۔ اور فائدہ ہے کچھ وقت ۔
یہاں سے گناہ کی ابتدا ہوتی ہے ۔ اللہ میاں نے تو آدم اور اس
کی جورو کو جنت میں ڈال ہی دیا تھا ۔ کوئی پوچھے کن اعمال کی جزا میں؟
کہا جائیگا ۔ عدم اعمال کی ۔ شیطان نے اُن کو بہکایا ۔ وہ کس کی مہربانی
سے ؟ بہشت کہاں تھا ؟ جہاں سے اُترنے کا حکم ہوا ۔ پھر آپس میں
دشمن بھی کر دیا ۔ یہ وہ خاصہ ہے ۔ جس کو اوپر ظلم اور کفر کے نام سے

بیان کیا گیا ہے۔ شیطان کی پیدائش ابتدائی قصور ہے۔ کس کا؟ سورہ (ص) میں مندرجہ بالا مکالمہ کی اور بھی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

قَالَ یَا اِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ ۔ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ ۝ وَّ اِنَّ عَلَیْكَ لَعْنَتِیْۤ اِلٰى یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۝ اِلٰى یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝

(سورہ ص ۔ رکوع ۵)

(اللہ نے) کہا اے شیطان! کیا چیز منع کرتی ہے تجھ کو سجدہ کرنے سے واسطے اس کے جسے پیدا کیا میں نے دونوں ہاتھوں سے ۔ تکبر کیا تو نے یا تھا تو بلند رتبہ والوں سے ۔ کہا ۔ میں بہتر ہوں اس سے ۔ بنایا تو نے مجھ کو آگ سے اور بنایا اس کو مٹی سے ۔ کہا ۔ پس نکل ان آسمانوں سے ۔ تحقیق تو راندہ ہے ۔ تحقیق تجھ پر لعنت ہے میری یوم قیامت تک ۔ کہا ۔ اے رب! ڈھیل دے مجھے اس دن تک کہ اٹھائیں جائیں گے مردے ۔ کہا ۔ کہ پس تو ڈھیل دیئے گیوں میں سے ہے ۔ یوم معلوم تک ۔ کہا ۔ پس قسم ہے عزت تیری کی ۔ گمراہ کروں گا ان کو اکٹھے ۔

شیطان کی پیدائش تو کی ہی تھی ۔ اور وہ آگ سے ۔ اب جب وہ اپنی جبلی خاصیت کے جوہر دکھانے لگا ۔ تو اللہ میاں ناراض ہوئے ۔ کیا جانتے نہ تھے ۔ کہ ہے ہی ایسا؟ سوال ہو سکتا ہے ۔ کہ جب یہ اللہ کے

اپنے اختیار میں تھا۔ کہ سب کو مطیع پیدا کرتا۔ تو شیطان کو کیوں نافرمانبردار
کر دیا؟ یا بھول چوک سے ایسا ہو گیا؟ اگر سہو نہیں ہوئی بلکہ ارادتاً اسے
متکبر بنایا گیا۔ تو ناراض ہونے اور ڈرانے دھمکانے سے کیا مطلب ہے؟
غریب کو ملعون تک کیا ہے۔ تاہم شانِ رحمٰنیت ہے۔ کہ اس نے مہلت
مانگی۔ تو دے دی۔ وہ کاہے کی؟ یوم قیامت تک لوگوں کو انسانوں
کو گمراہ کرنے کی۔ بھلا انسان پر یہ برکت کیوں نازل کی؟ تکبر کرے شیطان۔
اس کی سزا ملے انسان کو؟ خوب رحمٰنیت ہے!
مگر نہیں ساتھ لگے ہاتھ انسان کو ہدایت بھی کر دی ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ إِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝
إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ (بقر - ١٧٠)

اور مت پیچھے چلو شیطان کے۔ تحقیق وہ تمہارے لئے بڑا دشمن ہے۔
کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ حکم کرے تمہیں برائی اور بیحیائی کا۔
یا اللہ! اسے پیدا ہی نہ کرنا تھا۔ کیا تھا۔ تو ہمارا دشمن نہ بنانا تھا۔
اس نے حکم عدولی کی۔ اس پر لعنت ہوئی۔ تھا سیانا۔ کہ مہلت مانگ
لی۔ شانِ رحیمی کا واسطہ دے دیا۔ اسے مہلت دی جائے۔ اس میں
ہمیں اعتراض نہیں لیکن ہمیں بہکانے کی مہلت کیوں ہو؟ اس کی
شیطنت کا کوئی اور مصرف ہو جاتا۔

یہی صورت حق کا مکالمہ سورہ اعراف کے شروع میں آیا ہے۔ مہلت
ملنے پر شیطان نے اپنے اس عظیم عزم کی کہ وہ روز قیامت تک لوگوں
کو گمراہ کریگا۔ علت بتائی ہے۔

قَالَ فَبِمَآ أَغْوَيْتَنِيْ لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ

لَاٰتِیَنَّھُمۡ مِّنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡھِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِھِمۡ وَعَنۡ اَیۡمَانِھِمۡ وَ
عَنۡ شَمَآئِلِھِمۡ وَلَا تَجِدُ اَکۡثَرَھُمۡ شٰکِرِیۡنَ ۝ قَالَ اخۡرُجۡ
مِنۡھَا مَذۡءُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ؕ لَمَنۡ تَبِعَکَ مِنۡھُمۡ لَاَمۡلَئَنَّ جَھَنَّمَ
مِنۡکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ۝ (اعراف ۱۶-۱۷-۱۸)

کہا - چونکہ تُو نے گمراہ کیا مجھے - البتہ بیٹھونگا واسطے ان کے تیرے سیدھے راستے میں - پھر آؤنگا ان پر آگے سے - پیچھے سے - دائیں سے - بائیں سے - اور نہ پائیگا تو اکثر انہیں شاکر - کہا - نکل یہاں سے حقیر - راندہ - جو ان میں سے تیرے پیچھے لگیں گے تحقیق میں بھروں گا دوزخ تم سب سے -

شیطان کہتا ہی تو ہے - کہ مجھے اللہ نے گمراہ کیا ہے - جب اس کا وجود عدم سے ہوا - اور جب وہ اللہ کے حکم کا ہر طرح تابع ہے - تو اس میں شیطنت کا ملکہ پیدا ہی کس نے کیا ہے ؟ پھر اللہ تعالیٰ ہیں - کہ بجائے اس کے کہ کُن کہ کر اسے شیطان سے بھلا مانس بنا دیں - اُلٹا اس کی شیطنت کو قیامت تک کھُلی گمراہی کا موقعہ دیتے ہیں - اور اس گمراہی کا نشانہ کسے بناتے ہیں ؟ غریب انسانوں کو - وہ بھی تو جیسے اللہ نے بنا دئیے - بن گئے - کسی کی تقدیر میں گمراہ ہونا بد گیا - کسی کی قسمت میں شیطان سے بچا رہنا لکھا گیا - پھر یہ جھاڑ جھپٹ کیوں ؟ کہ دوزخ کو بھر دُونگا ؟ پہلے ہی ارشاد ہو چکا ہے - کہ دوزخ بھرا جانا ہے - اس لئے سب کو سیدھا راستہ نہیں دکھایا جائیگا - اس ازلی ارادہ کے راستے میں رکاوٹ کون پیدا کر سکتا ہے ؟ اب کہئے - نیکی بدی کا تصور وہم ہے یا کچھ اور ؟
اس پر بھی اللہ میاں فرماتے ہیں -

یٰمُوسٰٓی اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝ (نمل - ۹)

اے موسیٰ! تحقیق مَیں اللہ ہوں - بزرگ حکمت والا -

شیطان کے معاملے میں تو نہ بزرگی کا ہی ثبوت دیا ہے - نہ حکمت کا - ہاں! یہ اور بات ہے - کہ اپنے آپ کو کچھ کہہ لیں -

ایسے ہی قرآن کے متعلق فرمایا ہے -

لَا رَیْبَ فِیْهِ ۛ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝ (بقر - ۱)

اِس میں شک نہیں - راستہ دکھاتی ہے پرہیز گاروں کو -

پرہیز گار پہلے سے مقرر ہیں - راستہ کسے دکھانا ہوا؟ مُصنّف کے کہنے کا کیا ہے؟ دوسرے بھی کہیں - عجب بات ہے -

سورہ حجر میں شیطان نے پھر یہ قول دُہرایا ہے -

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ (سورہ حجر - ۴۶)

کہا - اے رب! چونکہ گمراہ کیا تُو نے مجھے - البتّہ زینت دونگا مَیں واسطے اُن کے زمین پر اور گمراہ کروں گا اُن سب کو -

یہ زینت دینا کیا ہے؟ دوزخ کے لئے سنوارنا؟ اللہ میاں کا ازلی قول ہی تو پورا ہو رہا ہے -

لیجئے اللہ میاں خود فرماتے ہیں -

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ۝ (مریم - ۸۳)

کیا نہیں دیکھا تُو نے بھیجا ہم نے شیطانوں کو اوپر کافروں کے - بہکاتے ہیں اُن کو ابھار کر -

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں - کہ ازلی موجود نقشہ اللہ تعالیٰ کے ہونے سے

فاعل حقیقی اسی کو ماننا ہوگا۔ کوئی بُرا ہے۔ تو اس لئے نہیں۔ کہ اُس نے جان بوجھ کر کسی قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اسے ایسا بنایا گیا ہے۔ اور یہاں تو آدم کو پڑھایا بھی خود ہے۔ فرشتوں کا مسجود بھی خود بنا دیا ہے۔ اور پھر شیطان سے بہکوا بھی دیا ہے۔ شیطان کا یہ بیان بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ کہ میں اللہ کا گمراہ کیا ہوا ہوں۔ یا تو اسے بناتے اللہ میاں سے سہو ہو گئی۔ اور اس کی بروقت تلافی نہ کر لی گئی۔ یا پھر اللہ تعالیٰ کی ازلی مرضی ہی یہی تھی۔ کہ اکثر انسان بے سمکر ہوں۔ اور ان سے دوزخ بھر جائے۔ قادر مطلق اللہ تعالیٰ کے سامنے چوں و چرا کی تو مجال کسے ہے؟ بغیر شیطان کا شکار ہوتے بھی دوزخ میں جانے کا حکم ہو۔ تو تعمیل کرنی ہی ہو گی۔ یہ بھی تو اللہ ہی کو منظور ہے۔ کہ ہم دوزخ میں جائیں۔ مگر اپنے اعمال کے بدلے ہیں۔ ہم ان اعمال پر مجبور ہیں۔ کریں گے۔ لیکن ایک بات کہیں گے اور ضرور کہیں گے۔ کہ جبر میں کئے گئے اعمال کی سزا جزا نہیں ہوتی۔ دوزخ کو سزا اور بہشت کو جزا کہنا غلط ہے۔ ہاں! اللہ کی قدرت اور مرضی کے آگے سر تسلیم خم ہے۔

فلسفے کے سامنے ایک اور معمّا بھی ہے۔ وہ یہ کہ خلق جب اللہ میاں کی عادت میں نہیں۔ تو یکایک یہ فعل اس سے سرزد کیونکر ہوا۔ اللہ کا اپنا اس میں کچھ فائدہ نہیں۔ اور ہو بھی تو ایک لاانتہا زمانہ وحدۂ لاشریک رہنے کے بعد موجودات کی اتنی کثرت کر دینے کا ملکہ کہاں سے آیا؟ اگر خلقت کا علم پہلے اللہ میاں کے ذہن میں تھا۔ تو اس علم کا استعمال پہلے کیوں کبھی نہ ہوا؟ اور اس پیدائش کے

بعد پھر اس استعمال کا کیا امکان ہے؟

کہا ہے۔

اَللّٰہُ یَبْدَ ؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔

(سورہ روم - ۱۰)

اللہ پہلی بار پیدائش کرتا ہے۔ دوبارہ کرے گا۔ اور پھر پھیرے جاؤ گے۔

مفسرین کی رائے میں پہلی پیدائش ہو چکی۔ دوسری پیدائش قیامت کے روز ہو گی۔ اور اس کے بعد پیدائش کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ تو اللہ میاں کی قدرت پیدائش اس کے بعد کس کام آئیگی۔ اللہ میاں کی طاقت میں کیا یہ تعطل کا نقص نہیں۔ کہ اس کی ازلی اور ابدی ہستی میں فقط دو دفعہ اس کی استعداد کام میں آئی؟ معطل صفات کا موصوف بھی معطل ہی تو ہو گا۔

علم الاذہان کے ماہر جانتے ہیں۔ کہ ہر مدرک موجودوں کا علم مشق و تجربہ کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ میاں کا موجودہ خلق سے پہلے کا تجربہ تو بیکاری کا ہے۔ پھر یکایک یہ نئی مشق کیونکر بہم پہنچی۔ کہ تمام موجودات کھڑے کر دیئے؟ مثلاً لکھا ہے۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِیْحًا فَرَاَوْہُ مُصْفَرًّا (سورہ روم - ۵۰)

اگر بھیج دیں ہم ایک ہوا تو دیکھیں کھیتی زرد ہوئی۔

کیا اللہ میاں نے اس سے پہلے زرد کھیتیاں کہیں بنا کر دیکھی تھیں۔ کہ ان کا بیان لوح محفوظ پہ ثبت ازلی کلام میں کر دیا۔ اگر یہی کائنات پہلی اور آخری ہے۔ تو اس سے پیشتر زردی موجود نہ تھی۔ اس کا ادراک

اللہ میاں کو کیونکر ہوا؟ کہا جا سکتا ہے۔ کہ موجودات ادراک کا نتیجہ ہیں۔ یہاں پہیلی یہ ہے۔ کہ اللہ میاں کے علم اور عمل میں سے پہلے کون تھا۔ اور پیچھے کون؟ علم الاذہان میں یہ دونو ایک دوسرے کے پیشرو بھی ہیں اور پیرو بھی۔ اللہ میاں کی کونسی صفت پہلے آتی ہے؟ صفت علم یا صفت عمل؟ عمیق فلسفیانہ سوال ہے۔ جس کا حل فقط ازلی عمل کے معتقدوں کے پاس ہے۔ بیچ میں عمل شروع ہو جانے سے اعتراض ہوتا ہے۔ کہ پہلے تو یہ عمل کبھی ہوا نہیں۔ پھر یہ ذہن میں کیسے آیا؟ اور ذہن میں تھا تو عمل کی صورت اختیار کرنے سے کیا چیز مانع رہی؟
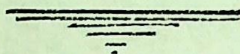
قرآن شریف کے پیغمبر

کسی مسلمان سے اپنا مذہبی عقیدہ دو الفاظ میں بیان کرنے کے لئے درخواست کرو۔ وہ جھٹ کہہ اُٹھیگا۔ توحید اور رسالت۔ توحید کے معنی ہیں پرماتما کو ایک ماننا۔ اور عقیدہ رسالت کا مفہوم ہے حضرت محمد کو رسول اللہ تسلیم کرنا۔ یہی نہیں۔ حضرت محمد سے پہلے دیگر پیغمبروں کا آنا بھی اسلام میں تسلیم کیا گیا ہے۔ ہم اسلام کی توحید اور پیغمبروں کی یکے بعد دیگرے بعثت کے مسائل پر کسی آئندہ باب میں غور کرینگے فی الحال ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ جن بزرگ ہستیوں کو اللہ کا بھیجا ہوا تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی اخلاقی فضیلت کس پایہ کی ہے؟ جس شخص سے کسی مذہب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم اس کے اقوال میں بھی بیان ہوتی ہے۔ مگر اقوال سے بڑھ کر خود اس کی اپنی مثال اس کے پیرووں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتی ہے۔ اِس اعتبار سے مذہبی پیشواؤں کی زندگی کا اخلاقی تبصرہ ایک نہایت اہم فرض ہے۔ جس کی تنقیدی ضرورت سے اغماض نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) قرآن عظیم کے ایک مہتم بالشان پیغمبر ہیں حضرت موسیٰ۔ ان کے متعلق فرمایا ہے۔

فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ

عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ٥ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ٥ (سورہ قصص - ۱۴-۱۵)

پس موسٰی نے اسے مکّہ مارا - اور اسے مار ڈالا - اس (موسٰی) نے کہا - یہ شیطان کے عمل سے ہے تحقیق وہ ظاہر گمراہ کرنے والا دشمن ہے - کہا - یا رب - میں نے ظلم کیا اپنی جان پر - پس معاف کر مجھے - پس اس نے اسے معاف کیا - تحقیق وہ معاف کرنے والا رحیم ہے

(۲) حضرت لوط کو مندرجہ ذیل آیت میں پیغمبر تسلیم کیا ہے

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ٥ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ٥ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ٥

(سورہ صافات - آیات ۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۴)

اور تحقیق لوط پیغمبروں میں سے ہے - جب ہم نے اسے نجات دی - اور اس کے تمام گھر والوں کو - مگر ایک بڑھیا لگی رہنے والوں میں سے - پھر ہلاک کیا ہم نے اوروں کو -

انہی حضرت لوط کے متعلق بائیبل میں مذکور ہے -

پھر حضرت لوط کی دونوں لڑکیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں -

(پیدائش باب ۱۹ - آیت ۳۶)

اگر قرآن کو بائیبل کے مندرجہ بالا تذکرہ سے اختلاف ہوتا تو اس میں اس اختلاف کا ذکر کیا جاتا - جیسے حضرت عیسٰی کی تثلیث کی تعلیم کے متعلق جابجا زور دے کر کہا ہے - کہ یہ تعلیم ان کی نہیں -

(۳) حضرت یوسف کا قصہ سورہ یوسف کے ایک بڑے حصے کا مضمون ہے - اس کا مکمل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں - حضرت کی بزرگی

یہ ہے۔ کہ آپ خوابوں کی تعبیر خوب کرتے ہیں۔ آپ کے عزیز مصر بننے
کی بنیاد ہی آپ کا ایک خواب ہے۔ جس میں آپ نے سورج۔ چاند
اور ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا تھا۔ عزیز مصر کے قیدی ہوتے
بھی آپ نے عزیز کے ایک خواب کی تعبیر بتائی تھی۔ جس کے صلے
میں آپ وہاں اعلیٰ رتبہ کو پہنچے۔ آپ کے بھائی جنہوں نے بچپن
میں آپ کو کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ آپ کے پاس آئے۔ آپ نے
انہیں واپس بھیج دیا۔ کہ جب تک دوسرے بھائی کو ساتھ نہ لاؤ تمہارے
ساتھ معاملہ نہیں ہو سکتا۔ اس بھائی کو آپ اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے
جس کے لئے آپ نے تدبیر یہ نکالی۔ کہ

فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ
مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ۝ (سورہ یوسف۔ ع ۹)

پھر جب تیار کر دیا ان کو۔ اسباب اُن کا۔ رکھ دیا پینے کا باسن
بوجھ میں اپنے بھائی کے۔ پھر پکارا پکارنے والا۔ اے قافلہ والو
تم مقرر چور ہو۔ (جلالین)

قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِن كُنتُمْ كَاذِبِينَ ۝ قَالُوا جَزَاؤُهُ مَن وُجِدَ
فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۝ (یوسف ع ۹)

بولے۔ پھر کیا سزا ہے اس کی اگر تم جھوٹے ہو۔ کہنے لگے اس کی سزا
یہ ہے۔ کہ جس کے بوجھ میں پائے۔ وہی جائے اُس کے بدلے
میں۔ ہم یہی سزا دیتے ہیں گنہگاروں کو۔ (جلالین)

اس پر تلاشی لی گئی اور برتن بھائی کے اسباب میں پایا گیا جس
کی وجہ سے اُسے وہاں رہنا پڑا۔ پرماتما جانے ان قصوں کے اندراج

سے الہام میں کیا فضیلت آتی ہے ؟

(۴) حضرت خضر نے ایک لڑکے کو مار ڈالا۔ حضرت موسٰی نے پوچھا۔

اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ط (سورہ یوسف۔ آیت ۷۳)

کیا تو نے مار ڈالا ایک جان پاک کو بغیر بدلے جان کے۔

حضرت نے جواباً فرمایا۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَا اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ٥ (سورہ یوسف۔ آیت ۸۰)

اور وہ لڑکا تھا۔ اس کے والدین مومن تھے۔ پس ڈرے ہم کہیں غالب آئے ان پر سرکشی اور کفر میں۔

حضرت خضر نے فقط قیاس کیا ہے۔ کہ کہیں بڑا ہو کر یہ اپنے والدین کو کافر نہ کر دے۔ اور اسے قتل کر دیا ہے۔ ہیں یہ بھی پیغمبر۔

(۵) یہ سب پیغمبر بزرگ ضرور ہیں لیکن خاتم النبیین تو حضرت محمد ہی ہیں۔ ان میں پیغمبری کی تمام فضیلتیں بدرجہ اُتم جمع ہوئی ہیں۔ آپ اہلِ اسلام کی نظر میں جامع الفضائل تسلیم کئے جاتے ہیں۔ حضرت کے بعض خانگی حالات کا ذکر بھی قرآن شریف میں آیا ہے۔ جس سے حضرت کے شخصی خصائل پر روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں جن آیات کا اقتباس کیا جائیگا۔ اُن کا ترجمہ ہم اپنے الفاظ میں نہیں۔ بلکہ قرآن کے مستند مفسرین جلالین کے الفاظ میں کریں گے۔ یہ ترجمہ لفظی نہیں معنوی ہے۔ واقعات کی توضیح کے لئے جلالین کے حاشیہ پر کچھ عبارت خطوط وحدانی میں اور کچھ بغیر خطوط کے درج ہوئی ہے۔ ہم نے توضیح کو ترجمہ سے جُدا رکھنے کے لئے

کچھ خطوط و حواشی اور بڑھادیئے ہیں۔ عبارت میں کوئی تحریف نہیں کی۔ ایک جگہ تفسیر جلالین کی روایت کے علاوہ تفسیر حسینی میں ایک مزید روایت پائی جاتی ہے۔ اسے بھی ہم نے جوں کا توں نقل کر دیا ہے۔

سورہ احزاب میں اللہ فرماتا ہے۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ ج وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ ط فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْھَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَھَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِھِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْھُنَّ وَطَرًا ط وَكَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا۔

(سورہ احزاب۔ آیہ ۳۷)

جب کہ تو کہتا تھا اس شخص کو جس کو اللہ نے (اسلام کی) نعمت دی اور تو نے اس پر (یہ) انعام کیا۔ (کہ اس کو آزاد کیا)۔ (مراد اس سے زید بن حارث ہے۔ وہ جاہلیت کے قیدیوں میں سے تھا۔ اس کو خرید لیا رسول اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبعوث ہونے سے پہلے اور آزاد کر کے متبنیٰ بنا لیا) کہ نہ چھوڑ تو اپنی بیوی کو۔ اور اللہ سے ڈر۔ (اس کو طلاق نہ دے) حالانکہ (اے محمد) تو اپنے جی میں پوشیدہ رکھتا تھا اس امر کو جس کو اللہ ظاہر فرمانے والا ہے (یعنی زینب کا محبوب رکھنا۔ اور یہ کہ اگر زید اس کو چھوڑ دیگا۔ تو میں اس سے نکاح کر لونگا۔ اور اس امر میں) تو لوگوں سے ڈرتا تھا (کہ وہ یوں کہیں گے۔ کہ محمد نے اپنے فرزند کی زوجہ سے نکاح کر لیا) حالانکہ اللہ سے زیادہ ڈرنا چاہئے۔ (اس امر

ہیں - اور اس نکاح میں بھی - اور لوگوں کے کہنے سے کچھ خوف نہ کرنا چاہئے) (پھر زید نے زینب کو طلاق دے دی اور اس کی عدت بھی گزر گئی - جیسا فرمایا اللہ تعالیٰ نے) پس جب پوری کرچکا زید حاجت اپنی زینب سے - ہم نے اس سے تیرا نکاح کردیا - ... ... یہ ہم نے اس لئے کہا - کہ مسلمانوں کو اپنے متبنٰی بیٹوں کی بیویوں سے کچھ تنگی نہ رہے - جب کہ وہ اُن کو طلاق دے دیں - اور اللہ جو حکم فرماتا ہے - وہ ہو کر ہی رہتا ہے - (جلالین)

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط (سورہ احزاب - آیۃ ۴۰)

محمد تم مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں (اس پر زینب اس کی بیوی حرام نہیں) ولیکن محمد اللہ کا پیغمبر اور خاتم الانبیا ہے -

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَاۤءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ (سورہ احزاب - ۵۰)

اے پیغمبر ہم نے تیرے لئے حلال کیں تیری وہ بیبیاں جن کو تو نے مہر دیا اور وہ عورتیں جو تیری مملوکہ ہیں - (یعنی وہ باندیاں - جو کافروں سے قید میں ہاتھ آئیں - جیسے صفیہ اور جویریہ)

وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ط

(سورہ احزاب - ۵۰)

اور جو کوئی عورت ہو مسلمان - اگر بخشے اپنی جان نبی کو - اگر نبی چاہے اُس کو نکاح میں لے - نری تجھ کو سوائے سب مسلمانوں کے - (یہ

خاص تیرے لئے درست ہے۔ نہ اور ایمان والوں کے لئے۔ یعنی
نکاح بدوں مہر کے لفظ ہبہ کے ساتھ خاص ہے۔ رسول اللہ علیہ وسلم
کے لئے)

یہ تو شادیوں کا جواز تھا۔ ایک آیت ممانعت میں نازل ہوئی ہے
لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ
اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ط

(سورہ احزاب - ۵۲)

(اے محمد) تجھ کو بعد ان (نو بیبیوں) کے (جنہوں نے تجھ کو اختیار
کیا)۔ اور کسی عورت سے نکاح کرنا درست نہیں۔ اور نہ یہ کہ ان
سب یا بعض کو چھوڑ کر ان کے عوض اور عورت سے نکاح کرے۔
اگرچہ ان کا حسن تجھ کو خوش آئے۔ مگر باندیاں (کہ وہ تجھ کو حلال
ہیں۔ چنانچہ آپ ان نو بیبیوں کے بعد ماریہ قبطیہ کے مالک ہوئے)
اس ممانعت میں بعض نکات خاص طور پر غور کرنے کے قابل
ہیں۔ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت رسول کے ازدواج کی ممانعت کیوں
کرنی پڑی؟ مزید ازدواج میں اللہ میاں کے خیال میں حضرت رسول
کے کون سے جذبے کے کارگر ہونے کا احتمال تھا؟ دوسرے یہ
کہ باندیوں کی اجازت پھر بھی رہی۔

سورہ تحریم میں ایک اور واقعہ کا ذکر ہے۔
يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ وَاللّٰهُ
مَوْلٰكُمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ

حَدِيثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا ۖ قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ۝ إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ۖ وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ ۝ عَسَىٰ رَبُّهُ إِنْ طَلَّقَكُنَّ أَنْ يُبْدِلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِنْكُنَّ مُسْلِمَاتٍ مُؤْمِنَاتٍ قَانِتَاتٍ تَائِبَاتٍ عَابِدَاتٍ سَائِحَاتٍ ثَيِّبَاتٍ وَأَبْكَارًا ۝ (سورہ تحریم - ۱-۲-۳-۴-۵)

اے پیغمبر کیوں حرام کرتا ہے وہ جو تیرے لئے اللہ نے حلال کیا۔ (یہاں اُمّت سے مراد اس سے ماریہ قبطیہ ہے۔ کہ اُس کو آپ نے حرام فرمایا تھا۔ قصّہ ان کا یہ ہے۔ کہ آپ نے اپنی باندی ماریہ قبطیہ سے صحبت کی حفصہ کے گھر۔ اور حفصہ اُس وقت وہاں نہ تھی۔ جب وہ آئی۔ اس کو یہ امر گراں گزرا۔ کہ ان کے گھر اس کے بچھونے پر ایسا ہوا۔ اس وقت آپ نے کہا۔ کہ ماریہ میرے اوپر حرام ہے) درآں حالیکہ (اُسے حرام کرتے ہیں) تو اپنی بیویوں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (اُس نے اس حرام کرنے کو تجھ سے معاف فرمایا) بیشک اللہ نے مقرر کیا تمہاری قسموں کو حلال کرنے (ساتھ کفارہ کے جو سورہ مائدہ میں مذکور ہوا۔ اور باندی کو حرام کرنا بھی قسموں میں داخل ہے۔ اور اس میں اختلاف ہے۔ کہ آپ نے کفارہ دیا یا نہیں ۔ ۔ ۔)

اور اللہ تمہارا مددگار ہے۔ اور وہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور (یاد کر) جب پیغمبر نے اپنی بیوی (حفصہ) سے آہستہ بات

کہی۔ (ماریہ کے حرام کرنے میں۔ اور اس سے کہہ دیا۔ کہ اس قصے کو کسی سے ظاہر نہ کرنا) سو جب خبر کی (حفصہ نے عائشہ کو یہ خیال کرکے کہ اس میں کچھ ہرج نہ ہوگا)۔ اور اس حال کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ظاہر کر دیا۔ تو کہہ دیا (پیغمبر نے) بعض قصہ (حفصہ سے) اور چھپا لیا (از راہ بزرگی تاکہ حفصہ کو ملال نہ ہو) سو جب پیغمبر نے حفصہ کو اس حال کی خبر دی۔ وہ کہنے لگی۔ تجھ کو اس کی خبر کس نے کر دی۔ (پیغمبر نے) کہا۔ مجھ کو اس کی خبر اللہ جاننے والے نے دی۔ اگر تم دونوں (اے حفصہ اور عائشہ) اللہ سے توبہ کرو۔ تو اللہ تمہاری توبہ کو قبول فرمائے گا۔ (پس بے شک تمہارے دل ماریہ کو حرام کرنے کی طرف راغب تھے۔ یعنی تم کو یہ امر خوش معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ رسول اللہ علیہ وسلم پر یہ امر گراں تھا۔ اور یہ گناہ ہے کہ تم اس امر سے خوش ہو جو آنحضرت کو برا معلوم ہو) اور اگر تم ایک دوسری کی مدد کرو (اس امر کے کرنے میں جو اس کو برا معلوم ہوتا ہے) تو اللہ اس کا مددگار ہے۔ اور جبریل اور نیک بندے مسلمان (یعنی ابوبکر اور عمر) اور تمام فرشتے ان کے بعد اس کے مددگار رہیں۔ (یعنی اس کی اعانت تمہارے مقابلے میں یہ سب کرینگے) اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کو طلاق دے۔ تو نزدیک ہے کہ اس کا رب اس کو اور بیویاں تم سے بہتر عطا کرے۔ کہ جو اسلام لانے والی۔ خالص ایمان والی۔ اللہ کی فرمانبردار۔ توبہ کرنے والی عبادت کرنے والی۔ روزہ رکھنے یا ہجرت کرنے والی ہونگی۔ باکرہ اور ثیبہ۔

تفسیر جلالین میں اس آیت کی تفسیر میں فقط یہی واقعہ بیان کیا گیا ہے لیکن تفسیر حسینی میں یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ اور اس کا بدل ایک اور واقعہ بھی تحریر کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ

نقل است کہ حضرت پیغمبرؐ شربت عسل دوست داشتے۔ وقتے زینبؓ مقدارے عسل داشت و ہرگاہ آنحضرت بخانہ وے آمدے۔ زینبؓ ترتیب شربت فرمودے۔ و آں حضرت را در خانہ وے بجہت آں توقفے بیشتر واقع شدے۔ آں حال بر بعضے از واج طاہرات گراں آمد۔۔ آنحضرت روزے شربت عسل آشامیدہ نزد ہر کدام آمد۔ گفتند۔ یا رسول اللہ از شما رائحہ مغفور مے آید۔۔ ۔ چوں ایں صورت مکرر وجود گرفت۔ حضرت فرمود۔ کہ حرمت العسل علی نفسی۔

کہتے ہیں کہ حضرت پیغمبر شہد کا شربت دوست رکھتے تھے۔ ایک دفعہ زینب کے پاس کچھ شہد تھا۔ جب حضرت اس کے گھر آتے۔ زینب شربت پلاتی۔ اس وجہ سے حضرت کو اس کے گھر میں زیادہ دیر ہو جاتی۔ یہ بات بعض ازواج طاہرات کو گراں گزرتی۔۔ حضرت ایک دن شہد کا شربت پی کر جس زوجہ مطہرہ کے پاس آئے۔ اس نے کہا۔ یا رسول اللہ آپ سے مغفور (ایک بدبودار عرق) کی بو آتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ جب یہ کیفیت دوسری دفعہ ہوئی۔ تو حضرت نے فرمایا۔ میں نے حرام کیا شہد اپنے اوپر۔

اللہ تعالیٰ کے اس قول پر کہ اگر حضرت محمد اپنی بیویوں کو طلاق عطا فرمائیں۔ تو ان کی جگہ اور بیویاں۔ بیوہ اور کنواری حضرت کو عطا ہوں گی تفسیر حسینی میں لکھا ہے۔

بکر ابن عباس فرمودہ کہ شیب آسیہ زن فرعون است - دبکر مریم مادر
عیسیٰ علیہ السلام - کہ حق سبحانہٗ وعدہ فرمودہ کہ ہر دو را در بہشت بحبالہ
ازداج حضرت رسالت پناہ درآرد -

بکر ابن عباس فرماتے ہیں کہ بیوہ فرعون کی بیوی آسیہ ہے اور کنواری حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کی ماں مریم - اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ دونوں کو بہشت
میں حضرت رسول اللہ کی بیویوں کے حبالہ میں لائیگا -

ظاہر ہے کہ جلالین کے نزدیک فقط مقدم الذکر یعنی ماریہ کا واقعہ درست ہے
اور مصنّف حسینی فیصلہ نہیں کر سکا کہ کونسی کیفیت حسب حال ہے - رشی دیانند نے ازراہ
انصاف دونوں قصوں کو بیان کر دیا ہے - تاکہ ناظروں کو اہل اسلام کی روایات
کے متعلق من مانی رائے قائم کرنے کا موقعہ نہ ہو +

مندرجہ بالا آیات اور ان کی تفاسیر پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں بغور طلب فقط
یہ امر ہے - کہ اگر اہل اسلام کا یہ دعویٰ درست ہو - جو وہ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں - کہ
پیغمبروں کی زندگیاں اخلاقاً ہر طرح کے عیوب سے پاک ہوتی ہیں تو کیا جن الفاظ میں قرآن شریف
نے ان بزرگوں کی زندگیوں پر روشنی ڈالی ہے ان کے اعتبار سے یہ تمام حضرات پیغمبر ہونیکے
قابل ہیں یا نہیں؟ اور کیا ان تمام بزرگوں کے حالات حیات کو عوام کے سامنے بطور نصب العین
پیش کیا جا سکتا ہے؟ حضرت موسیٰ نے قتل کیا - حضرت لوط نے اپنی بیٹیوں سے اولاد پیدا
کی اور حضرت محمد نے نو بیویاں اور کچھ باندیاں قبول فرمائیں - اور زید جب ایک دفعہ متبنیٰ کر چکے
اس کی مطلوقہ بیوی سے شادی فرمائی - بقول جلالین عوام میں بدنام ہونے کے
ڈر سے کچھ عرصہ اپنی محبت اور شادی کے ارادے کو مخفی رکھا -

جس انداز سے ان واقعات کا ذکر قرآن شریف میں ہوا ہے - اس سے یہ سوال
بھی قدرتاً ناظر کے دل میں اٹھتا ہے کہ کیا اس قسم کے خانگی قصے کسی الہامی کتاب کا حصہ ہونے بھی چاہئیں

ایمان کے دو وسیلے ہیں۔ ایک عقل۔ دوسرا براہ راست عقیدہ۔ صحیفۂ قدرت دونوں کے سامنے کھلا ہے۔ صبح سورج کا طلوع۔ شام سورج کا غروب۔ دن اور رات کا تواتر۔ شفق کی رنگا رنگی۔ بادلوں کی پرواز۔ کسی بدلی میں سے کرنوں کا چھننا۔ اور قوس و قزح بن جانا۔ پہاڑوں کی سر بفلک اونچائی۔ سمندر کی بے قیاس گہرائی۔ وہاں برف کے تبے اور تلعے۔ یہاں اچھلتی کودتی لہروں کا شور۔ عقل دیکھ دیکھ کر حیران ہے۔ زمین پر تو مخلوق ہے ہی۔ ہوا اور پانی میں ایک اور دُنیا بس گئی ہے۔ علوم طبعی کے ماہرین نئے قوانین دریافت کرتے ہیں۔ اور ان قوانین کے طفیل قدرت پر گویا قادر ہوتے جاتے ہیں۔ جو واقعات پہلے نہایت تعجب خیز معلوم ہوتے تھے۔ وہ ان قوانین کی روشنی میں معمولی سے واقعات ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انسان یہ دیکھ کر دنگ ہے۔ کہ پانی آسمان سے کیونکر برستا ہے؟ طبیعی ایک ہنڈیا میں پانی ڈال کر اسے آنچ دیتا ہے۔ پانی سوکھتا ہے۔ اڑتا ہے۔ طبیعی اس اڑتے پانی کو ٹھنڈی نلی میں سے

گزارتا ہے۔ اور اُڑتی ہوئی بھاپ کو پھر پانی بنا دیتا ہے۔ وہی
اُڑا ہوا پانی قطرہ ہو کر پھر گر پڑتا ہے۔ طبیعی کہتا ہے۔
یہی بارش ہونے کا راز ہے۔ ہم نے معجزہ سمجھا تھا۔
پرماتما کی قدرت کا خاص ظہور مانا تھا۔ طبیعی نے وہی معجزہ
چھوٹے پیمانے پر خود کر کے دکھا دیا۔ ہماری حیرت جاتی
رہی۔ ہم سمجھے پرماتما نہیں ہے۔ ہم قوس و قزح پر
لٹو تھے۔ طبیعی نے سہ پہلو شیشے میں ہی ایک چھوٹی سی
قوس و قزح پیدا کر دی۔ ہم اسے معمولی بات سمجھ بیٹھے۔ طبیعی
سیانا تھا۔ ہماری سادگی پر ہنسا۔ کہا۔ میری قدرت اوّل تو
پیمانے میں چھوٹی ہے۔ بے مقدار ہے۔ بھلا اس ذرا
سی قوس و قزح کا اس پھیلی ہوئی لمبی قوس و قزح سے
مقابلہ ہی کیا۔ جو آسمان کے ایک حصے میں چھا جاتی ہے۔ میرے
قطرے بھر پانی سے کوئی کھیت سیراب ہو سکتے ہیں۔ یا جھیلیں
بھر سکتی ہیں؟ وہ خزانے پرتھوی کے ہیں۔ جن کی دنیا
سوالی ہے۔ محتاج ہے۔ پھر میری دریافتیں اور ایجادیں
تو پرماتما کی صنعتوں کی فقط نقل ہیں۔ وہ اسی بھنڈار کی ایک
بانگی ہے۔ جو چیز عالم موجودات میں پہلے سے پڑی ہے۔
میں اسے دیکھتا ہوں۔ اس کی کیفیت کا چربہ اپنی عقل
میں اُتارتا ہوں۔ اور اپنی بساط کے مطابق اسی ذخیرہ سے
ایک چھوٹی سی بانگی اخذ کرتا اور اس پر پرماتما ہی کے
قانونوں کا اطلاق کر دینے سے کہیں قوس و قزح کا کھلونا کہیں

پانی اور بھاپ کی گڑیا بنا لیتا ہوں ۔ یہ قانون کا ایک حقیر سا حصہ جو
میری جزوی عقل میں آتا ہے ۔ پرماتما کو عقل کل کا مالک ثابت کرتا ہے ۔ اگر
اس کی قدرت کا ظہور بغیر قانون کے ہوتا ۔ تو انسان کے لئے اپنی کوشش
کی بار آوری پر اعتبار کرنا مشکل تھا ۔ اس کھیتی میں جس سے ہم سب
کا پیٹ پلتا ہے ۔ کیا کچھ کم معجزہ ہے ؟ ایک دانے کے ہزار بلکہ لاکھ کروڑ
دانے ہو جاتے ہیں ۔ پرماتما ہی تو انہیں بڑھاتا ہے ۔ چونکہ قانون کے
ماتحت بڑھاتا ہے ۔ ہم اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں ۔ اگر اس میں قاعدہ
یا قانون نہ ہو ۔ تو کوئی کس بھروسے پر بیج بوئے ۔ اسے پانی دے ۔
اور فصل کاٹے ؟ یہ ہے عقل کے ذریعے ایمان ۔ جاہل عقل سے کورا
ہے ۔ اسے روز کی کھیتی میں پرماتما کا ہاتھ نظر آنا مشکل ہے ۔ سورج اور
چاند کے تماشے اس کی نظر میں پرماتما کی طاقت کے تماشے نہیں ۔ پرماتما
اور اس کے ساتھ اس کے پیاروں کی طاقت کا ظہور کسی خارق عادت
کرامت کے ذریعے ہونا چاہیئے ۔ اس طفلانہ خیال نے جاہلوں کے دلوں
میں معجزات کی خلقت کی ہے ۔ وہ انہی لوگوں کو خدا رسیدہ یقین کرتے
ہیں ۔ جن سے کوئی کرامت یا غیر قدرتی فعل وابستہ ہو ۔ بعض مذاہب
کا دارومدار ہی انہی کرامات کے قصوں پر ہے ۔ خود معجزہ کرنا مشکل
ہے ۔ کیونکہ اس کے راستے میں قانون قدرت حائل ہے ۔ اس لئے
ان مذاہب کے صحیفوں میں معجزوں کے عدم امکان کا گونہ اقبال
کیا گیا ہے ۔ چنانچہ انجیل میں مذکور ہے ۔

اس (عیسیٰ) نے اپنی آتما میں ٹھنڈا سانس لیا ۔ اور کہا ۔ یہ پیڑھی
معجزہ کیوں چاہتی ہے ؟ میں تمہیں سچ کہتا ہوں ۔ اس پشت

کو معجزہ نہیں دکھایا جائیگا (مارکس ۸-۲۲)

اور قرآن میں بھی آیا ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِنْ رَبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (سورہ عنکبوت - آیات ۵۰-۵۱)

اور کہتے ہیں کیوں نہیں اُترتیں - اس پر نشانیاں طرف سے اس کے رب کے - کہہ - نشانیاں پاس اللہ کے ہیں - اور تحقیق میں ڈرانے والا ہوں ظاہر - اور کیا کفایت نہیں کرتی اُنہیں - کہ اُتاری ہے ہم نے کتاب تجھ پر - جو پڑھی جاتی ہے ان پر اور اس میں رحمت ہے - اور ذکر ہے واسطے مومنوں کے -

لیکن متقدمین کے بارے میں معجزات کی کہانیاں سنانے میں کوئی قانون مانع نہیں - اس لئے ایسی کتب میں ان کتابوں کے اپنے زمانے کی کرامت کا لاکھ انکار ہو - گذشتہ زمانوں کے پیغمبروں سے معجزات منسوب کر دیئے گئے ہیں - وقت گزرنے پر عقیدت مندوں نے ویسے ہی اور ان سے بھی بڑھ کر عجیب و غریب معجزات کا تعلق اپنے ہادیوں کی زندگی سے بھی کر دیا ہے معجزہ درحقیقت پرماتما کی قدرت کا اعتراف نہیں - انکار ہے - پرماتما قدیم ہے - جاوید ہے - تو اس کی قدرت کا اظہار بھی قدیم ہے - جاوید ہے - لمحہ لمحہ میں ہوتا ہے - پرماتما کا ادراک کامل ہے - اس ادراک کا گویا مجسمہ قدرت کے قواعد ہیں - جہاں یہ قواعد ٹوٹیں - سمجھو - پرماتما کے ادراک کا ازالہ ہوا - پرماتما کے علم اور عمل میں تبدیلی

ہونا ناممکن ہے۔ اس علم اور عمل کا اظہار روزمرہ کے واقعات میں ہو رہا ہے۔ ان کا سانچہ پلٹنے کی عقل سلیم کو ضرورت نہیں۔ البتہ جن لوگوں کا مسلمہ بادشاہت کا ہی یہ ہے۔ کہ وہ قانون سے بالا ہو۔ جس پر دلیل چون وچرا نہ کر سکے۔ وہ پرماتما کو بھی ایک بڑا، سارے عالم پر محیط، نرنگی، بادشاہ تصور کر سکتے ہیں۔ جس کی مرضی کا اعتبار نہیں۔ اپنی یا اپنے پیاروں کی خاطر کسی وقت کچھ کر گذرے۔ کسی پر دل آگیا۔ اسے رجھانے کو کچھ بھی کر دینا اس سے بعید نہیں۔ آج کل ان بادشاہوں کا دور نہیں رہا۔ سو پرماتما کا تصور بھی بدل رہا ہے۔ وید کی نظر میں قدرت کے قوانین پرماتما کے پاک حکم ہیں۔ ان کے تجاوز سے پرماتما نعوذباللہ اپنا تجاوز کر گذریگا۔ یہ ناممکن ہے۔ پرماتما کے پیارے وہ ہیں جن کی زندگی قوانین طبعی و روحانی کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ جن کا اخلاق ہی ان کی عظمت ہے۔ وہ قانون توڑتے نہیں۔ اس کے علم کی اشاعت کرتے ہیں۔ ان کی عقیدت عقل کے ساتھ ہمزبان ہو کر اس ایمان کا اظہار کرتی ہے۔ جس کا پاک نام وید ہے۔

برخلاف اس کے قرآن شریف میں جابجا معجزات کا ذکر آیا ہے۔ ہم ذیل میں چند ایک انبیا کرام کے متعلق قرآن شریف کی شہادت پیش کریں گے۔ جس سے ظاہر ہو۔ کہ ان کی فضیلت کا انحصار قرآن کی نظر میں ان کے اخلاق پر نہیں۔ معجزات پر ہے۔ قرآن شریف کے کچھ پیغمبروں کے اخلاق پر ایک مختصر سا تبصرہ گذشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ اخلاقی اور روحانی کمال موجود ہونے کی صورت میں کسی شخص کی زندگی معجزات کی محتاج نہیں رہتی۔ انسانوں کے لئے مفید اور قانون قدرت

کے یا یوں کہو کہ پرماتما کی مرضی کے، رنگ میں رنگا ہوا دستورالعمل سب
سے بہترین معجزہ ہے۔ جو رشی دیانند اور ان کے پیشرو وید کے رشیوں
کے حصے میں آیا ہے۔ دیگر بزرگ بھی اس فضیلت سے خالی نہ ہونگے
مگر ہمیں یہاں ان بزرگوں کے ان تذکرات سے واسطہ ہے۔ کہ جو ان
کے پیروؤں کی روایات کی بدولت ہم تک پہنچے ہیں۔ اس باب میں ہمیں
دیکھنا یہ ہوگا۔ کہ ان بزرگوں کے معجزات کس قدر قرین قیاس ہیں؟ اگر
بفرض محال ان کی تاریخی صداقت کو لمحہ بھر کے لئے تسلیم کر ہی لیا جائے
تو اس سے زمانہ حال کی انسانی جماعت کیا فائدہ اٹھا سکتی ہے؟ انبیاء
کرام کی اخلاقی تقلید کا دروازہ اسلامی مسئلہ تقدیر کے ہاتھوں بند ہے۔
کیونکہ ہم ویسے ہی اعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ جیسے شروع سے ہماری
قسمت میں بد گئے۔ پھر اعجازی کرامت تو

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ہمارے کس کام کی؟ فی الحال ہمیں ان معجزات کی مروجہ کیفیات پر
ایک نظر ڈالنی چاہیئے۔ ممکن ہے۔ اس میں ہمارے مفید مطلب بھی
کوئی بات نکل آئے۔

ہم نمونتہً ان پیغمبروں کے چند معجزات کا مختصر تبصرہ کئے لیتے
ہیں:-

(۱) حضرت موسیٰ (۲) حضرت مسیح
(۳) حضرت ابراہیم (۴) حضرت صالح
(۵) حضرت نوح (۶) حضرت محمد

۱۔ حضرت موسیٰ

حضرت موسیٰ کا قصہ قرآن شریف میں بارہا دوہرایا گیا ہے۔ مگر ہم چند ایک ایسے حوالہ جات پر اکتفا کریں گے۔ جن سے ان حضرت کے کئے ہوئے یا ان کی کہانی میں مذکور خارق عادت کارناموں پر روشنی پڑ سکے۔

انسان بندر بن گئے۔

سورہ بقر میں فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا (البقر ۶۵-۶۶)

اس کی تشریح تفسیر جلالین میں یوں کی گئی ہے۔

البتہ قسم ہے۔ کہ تم جانتے ہو۔ ان کو جنہوں نے (باوجود ممانعت کے) ہفتہ کے دن (مچھلی کا شکار کر کے) حد سے تجاوز کیا۔ (وہ لوگ ایلہ کے رہنے والے تھے) سو ہم نے ان کو کہا۔ کہ تم بندر ہو جاؤ۔ رحمت سے دور۔ (سو وہ ہو گئے اور تین دن کے بعد مر گئے) پس ہم نے (اس عذاب کو) ان کے زمانے کے بعد اور پچھلے لوگوں کے واسطے عبرت کا سامان کر دیا۔ (جلالین)

جسموں کا فوری تبادلہ کس قانون قدرت کی رُو سے ہوا؟ حضرت ڈاروِن کو مشکل تھی۔ کہ بندر کی دُم انسان کے قالب میں گم کیونکر ہو گئی؟ ناظرینِ قرآن کو مشکل یہ ہے۔ کہ دُم پیدا کیونکر ہو گئی؟ ہو گئی۔ مذہب میں دلیل کا دخل نہیں۔

مُردہ بول اُٹھا

اسی سورہ میں فرمایا ہے۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (بقر ۷۳)

جب کہ تم نے ایک آدمی کو مارا۔ پھر اس میں جھگڑا کیا۔ اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے اس امر کو۔ جس کو تم چھپاتے تھے .. پھر ہم نے کہا۔ کہ اس (مقتول) سے اس (گائے) کی (لفظی معنی ہیں اس (گائے) کا ایک ٹکڑا) (جیب یا دُم کی ہڈی مارو (انہوں نے مارا اور وہ زندہ ہو گیا۔ اور اپنے دو چچا کے بیٹوں کی نسبت کہا۔ کہ انہوں نے مجھ کو مارا ہے۔ یہ کہہ کر مر گیا .. ..) اللہ تعالیٰ .. .. اسی طرح مُردوں کو زندہ کریگا۔ وہ تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلاتا ہے .. کہ تم سوچو۔ (جلالین)

گائے کا ایک ٹکڑا لگنے سے مُردہ جی اُٹھا۔ نہ جانے۔ مرا کیا لگنے سے؟ پر مرتے تو لوگ روز ہیں۔ کرامات چینے میں تھی۔ بنکم چندر بنگال کے مشہور ناولسٹ مجسٹریٹ تھے۔ ایک مقدمہ میں حقیقت حال کا پتہ نہ لگتا تھا۔ آپ نے مُردے کا سوانگ بھرا۔ لاش بن کر پڑے رہے۔ اور اس

پر کپڑا ڈال دیا گیا۔ مجرم بھی وہیں تھے۔ باتوں باتوں میں وہ بے تکلف ساری واردات سچ سچ کہہ گئے۔ مردہ جلانے سے پہلے جی اٹھا۔ اور کچہری میں واقعے کی شہادت دے گیا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت تو ان آیات میں مرقوم نہیں؟ یہ فرق ضرور ہے۔ کہ بنکم پھر زندہ ہی رہے تین دن بعد مرے نہیں۔

ڈنڈے کی کرامات

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ط (البقرہ-۲-۶۰)

جب کہ (اس جنگل میں) موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے پانی مانگا۔ سو ہم نے کہا۔ کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مار (یہ وہی پتھر تھا جو موسیٰ کے کپڑے لے بھاگا تھا۔ نرم چوکھوٹ جیسا آدمی کا سر۔ سو اس نے مارا) پس بارہ چشمے (جتنے وہ گروہ تھے) اس میں سے نکل کر بہنے لگے۔ (جلالین)

ڈنڈہ اژدہا ہو گیا

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ (اعراف - ۱۰۶-۱۰۷)

پس (موسیٰ نے) اپنی لاٹھی ڈالی۔ سو ناگاہ وہ بڑا اژدہا ہو گیا۔ اور (موسیٰ نے) اپنا ہاتھ (گریبان سے) نکالا۔ اور وہ روشن چمکتا ہوا ظاہر ہوا۔ دیکھنے والوں کی نظر میں (حالانکہ پہلے اس ہاتھ

کی یہ رنگت نہ تھی۔ گندم گون تھا) (جلالین)

پتلا سانپ

سورہ نمل میں ذکر ہے۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَانٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ط يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ط (نمل-۱۰)

اور اپنی لاٹھی ڈال (سو موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈالی۔ (اس نے) جب (اس لاٹھی کو) دیکھا۔ کہ دوڑتی ہے۔ جیسے پتلا سا سانپ۔ موسیٰ پیٹھ پھیر کر دوڑا۔ اور پیچھے کو نہ لوٹا۔ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) اے موسیٰ! تو اس سے خوف نہ کر۔ (جلالین)

ویدانت میں وہم سے رسی کو سانپ سمجھنے کا ذکر تو اکثر ہوتا ہے یہاں نہ جانے وہم تھا؟ یا حقیقی کیفیت تھی؟

ٹڈیوں۔ جوؤں اور مینڈکوں کا مینہ

لوگ حضرت موسیٰ پر ایمان نہ لائے۔ بس پھر کیا تھا؟

نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ (اعراف ۱۳۲-۱۳۳)

ہم کبھی تیرا یقین نہ کریں گے۔ اور ایمان نہ لائیں گے (سو موسیٰ نے ان پر بد دعا کی) پھر ہم نے ان پر پانی کا طوفان بھیجا (کہ سات دن تک ان کے گھر پانی بھرا رہا۔ جو بیٹھے ہوئے آدمی کے حلق تک پہنچا تھا) اور بھیجا ٹڈیوں کو (سات دن کہ ان کی کھیتی اور پھل کھا گئے

اور بھیجا) جوؤں کو (یا وہ کیڑا جو اناج میں پیدا ہو جاتا ہے) یا چیچڑی کو کہ اس نے ٹڈی کا بچا ہوا کھایا - اور کچھ باقی نہ چھوڑا اور بھیجا ان پر مینڈک رنگ وہ اُن کے گھروں اور کھانے میں بھر گئے) اور خون کو (ان کے پانی میں) اور یہ نشانیاں ظاہر (بھیجیں)

کسی کی سمجھ میں یہ کرامات نہ آئے - تو اس کا علاج وہی ہے - جو اس آیت کے مطابق ایمان نہ لانے والوں کا ہوا یعنی پانی کا طوفان ٹڈیاں جوئیں - خون اور مینڈک - اس خطرے کے ہوتے کون ہے - جو بے ایمان رہے؟

دریا دو ٹکڑے

آگے فرمایا ہے -

فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ فِی الۡیَمِّ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِیۡنَ ٥ (اعراف ۱۳۶)

پس ڈبا دیا اُن کو دریائے شور میں - اس سبب سے کہ بیشک وہ ہمارے حکموں کو جھٹلاتے تھے - اور (ہماری آیتوں سے) بے خبر تھے - کچھ غور و فکر نہ کرتے تھے - (جلالین)

وَجٰوَزۡنَا بِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡبَحۡرَ (اعراف - ۱۳۸)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا -

اس واقعہ کی کیفیت اس سے پہلے مندرجہ ذیل آیت میں بیان ہو چکی ہے -

وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَیۡنٰكُمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ٥ (البقرہ - ۵۰)

جب کہ ہم نے تمہارے (بنی اسرائیل کے) سبب دریا کو چیرا تا کہ
تم (دشمنی سے بھاگ کر اس میں داخل ہو جاؤ) سو ہم نے تم کو
ڈوبنے نہ دیا۔ اور ڈبو دیا قوم فرعون کو (معہ فرعون کے) اور تم
دیکھتے تھے (دریا کے مل جانے کو اُن پر) (جلالین)
آج کل کی پن ڈبی کشتیاں اس سے بھی کہیں زیادہ معجزہ دکھا
رہی ہیں +

۲۔ حضرت مسیح

خداوند مسیح کو مسلمان وہ درجہ عطا نہیں کرتے۔ جو عیسائی صاحبان
کرتے ہیں۔ لیکن حضرت مسیح سے بھی کچھ معجزات خود قرآن میں ہی منسوب
کیے گئے ہیں۔ چنانچہ سورہ بقر آیت ۸۷ میں ذکر ہے۔
وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ
(سورہ بقر۔ آیت ۸۷)
اور عیسیٰ مریم کے بیٹے کو معجزے دیئے (زندہ کرنا مُردوں کو اور
اندھے مادر زاد اور جذامی کو اچھا کرنا) اور اُن کو قوت دی جبریل
سے (جہاں عیسیٰ چلتے۔ جبریل ان کے ساتھ ہوتے تھے) (جلالین)

بغیر باپ کے پیدائش

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ
وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ٥　(آل عمران۔ ۳۹)

اور جب فرشتے بولے اے مریم! اللہ نے تجھ کو پسند کیا اور ستھرا بنایا۔
(حاشیہ پر ہے۔ "مرد کے قریب ہونے سے پاک کیا") اور پسند
کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں سے۔ (جلالین)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝
فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا
بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ
تَقِيًّا ۝ قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝
قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ
بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ج وَ
لِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ۔۔ ۔۔ ۔۔ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ
بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ (مریم - ۱۲)

یاد کر قرآن میں قصہ مریم کا جب کہ وہ جدا ہوئی اپنے گھر والوں سے
ایک گوشے میں جو مکان کے شرقی جانب میں تھا (وہاں جاکر)
گھر کے لوگوں کے سامنے پردہ چھوڑ دیا۔ (تاکہ کوئی نہ دیکھے۔ یہ
پردہ اس لئے چھوڑا تھا کہ اپنے سر سے یا کپڑوں سے جوں نکالتی تھی۔ یا
غسل کرتی تھی حیض سے پاک ہوکر) سو بھیجا ہم نے اُن کی طرف اپنی رُوح
(یعنی جبریل) کو۔ سو وہ ہو گیا آدمی پورے ہاتھ پیر والا خوبصورت۔
(بعد اس کے کہ مریم اپنے کپڑے پہن چکی تھی) مریم بولی۔ بے شک میں
تجھ سے رحمٰن کی پناہ چاہتی ہوں۔ اگر تو کوئی پرہیزگار مرد ہے۔ (تو
میرے پناہ مانگنے کی وجہ سے مجھ سے علیحدہ رہ) جبریل نے کہا۔ بات یہ ہے
کہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں۔ کہ تجھ کو عطا کردوں) ایک لڑکا پاک (یعنی

پیغمبر ہوگا) مریم نے کہا میرے لڑکا کیونکر ہوگا۔ حالانکہ کسی مرد نے مجھ کو (نکاح کرکے) ہاتھ نہیں لگایا۔ اور نہ میں زناکار ہوں۔۔ جبرئیل نے کہا (یہ امر ضرور ہونے والا ہے۔ یعنی تجھ سے بدوں باپ کے ضرور لڑکا پیدا ہوگا) تیرا رب فرماتا ہے۔ کہ یہ امر مجھ کو آسان ہے (اس طرح کہ جبرئیل میرے حکم سے تیرے اندر پھونک مارے۔ تو اس سے حاملہ ہو جائے)۔۔ (اور ہم اس کو ضرور پیدا کریں گے تاکہ بنائیں اس کو اپنی قدرت کی نشانی۔۔ پس حاملہ ہوئی مریم۔ اور چلی گئی (بوجہ حمل ہونے کے اپنے گھر والوں سے) دُور۔ (جلالین)

فرشتے آج بات نہ کریں۔ پُرانے زمانے میں کرتے تھے۔ پرماتما کا پیغام لاتے۔ اور اس کے احکام کی تعمیل میں طرح طرح کی نعمتیں بنا کر جاتے تھے۔ حضرت مریم کو بغیر خاوند کے بیٹا دیا۔ حضرت یحییٰ کو بغیر طاقت کے فرزند۔ اس سائنس کے زمانے میں اللہ میاں اور اس کے فرشتے سب سائنس دان ہو گئے ہیں۔ مجال ہے کوئی بات خلاف قانون کر جائیں۔

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورہ انبیاء ۔ ۸۸)

اور یاد کر مریم کو جس نے اپنی شرمگاہ کو (برے فعل سے) محفوظ رکھا۔ سو ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔ (یعنی جبرئیل نے اس کے کرتے کے گریبان میں پھونک ماری۔ جس سے ان کو عیسیٰ کا حمل رہ گیا) اور ہم نے مریم کو اور اس کے بیٹے کو آدمیوں۔ جنوں اور فرشتوں کے لئے ایک نشانی بنائی۔ (کیونکہ مریم نے عیسیٰ کو بدوں خاوند کے جنا) (جلالین)

۴۔ حضرت ابراہیم

کٹے جانور زندہ کئے

حضرت ابراہیم ایک پرانے پیغمبر ہیں۔ حضرت محمد کا دعوےٰ ہے کہ اسلام حضرت ابراہیم ہی کا مذہب ہے۔ ان کے ایک خارق العادت کارنامے کا ذکر سورہ بقر میں اس طرح درج ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتیٰ ط قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط قَالَ بَلیٰ وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ا قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلیٰ کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ط وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔

(سورہ بقر۔ آیت ۲۵۶)

ابراہیم نے کہا۔ اے میرے رب تو مجھ کو دکھلا۔ کہ مردوں کو کیونکر جلا دیگا۔ (اللہ نے ان سے) فرمایا۔ کیا تجھ کو اس پر ایمان نہیں۔ (کہ مجھ کو قدرت ہے۔ کہ مردوں کو جلا دوں) .. .. .. (ابراہیم نے) کہا۔ کہ میں بے شک ایمان لایا (تیری قدرت پر۔ یہ میں نے تجھ سے اس لئے پوچھا۔ کہ آنکھ سے دیکھ کر پورا) اطمینان دلی حاصل کر دوں۔ (اور مخالفوں سے دلیل کر سکوں۔ اللہ نے) فرمایا۔ پس، تو چار پرند پکڑ۔ اور ان کو اپنے پاس جمع کر۔ (اور ان کو کاٹ کر

ان کے پر اور گوشت ملا کر پھر اپنی زمین کے پہاڑوں ہیں سے ہر پہاڑ پر ایک ٹکڑا ان کا رکھ دے۔ پھر ان کو اپنی طرف بلا۔ وہ دوڑ کر آئیں گے۔ اور جان لے اللہ غالب ہے (کسی چیز سے قاصر نہیں اس کے کام مضبوط اور محکم ہیں) رسو ابراہیم نے مور اور کرگس اور کوا اور مرغ پکڑا۔ اور ان کا گوشت اور پر کاٹ کر ملا دیئے اور اُن کے سر اپنے پاس رکھ لئے۔ اور اُن کو بلایا۔ سو تمام ٹکڑے اُڑ کر جس کا جو ٹکڑا تھا۔ اس ہیں جا ملا۔ یہاں تک کہ پورے ہو کر اپنے اپنے سروں سے مل گئے۔ (جلالین)

۴ حضرت صالحؑ

اللہ میاں کی اُونٹنی

قوم ثمود کے پیغمبر صالح کے متعلق سورہ ہود میں آیا ہے۔ کہ اُنہوں نے فرمایا۔

وَ یٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِیْبٌ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ ۝ (سورہ ہود۔ ۶۳)

اور اے میری قوم یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ تمہارے لئے نشانی پس چھوڑ دو اس کو۔ کہ پھرے اللہ کی زمین میں۔ اور اس کے

ساتھ کسی قسم کی برائی سے پیش نہ آؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو تم پر بہت عذاب آئے گا۔ سو انہوں نے اس کے پیر کاٹے۔ (یعنی ایک شخص قزار نام نے اس قوم کے کہنے سے اونٹنی کے پیر کاٹ ڈالے)۔ (صالح نے) فرمایا۔ زندہ رہو تم اپنے گھروں میں تین دن۔ پھر تم ہلاک کر دئے جاؤ گے۔ (جلالین)

سورہ بنی اسرائیل میں کہا ہے

وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ط (بنی اسرائیل۔ ۷۔ د)

اور ہم نے ثمود کی طرف ناقہ کو بھیجا۔ جو ظاہر نشانی تھی۔ سو انہوں نے اس کا انکار کیا۔ (پس وہ ہلاک کئے گئے)

تفسیر حسینی میں اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے۔

ثمود از صالح معجزہ طلب کردند۔ و خدائے برائے ایشاں از سنگ ناقہ بیروں آورد۔

ثمود نے صالح سے معجزہ مانگا۔ اور خدا نے ان کے لئے پتھر سے اونٹنی پیدا کر دی

سورہ شعرا میں فرمایا ہے۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ٥

کہا۔ یہ اونٹنی ہے۔ اس کے لئے ایک حصہ معین ہے پانی کا۔ اور تمہارے واسطے ایک دن معین کا حصہ ہے۔ (جلالین)

موضح القرآن میں اسی محل پر فرمایا ہے۔

وہ چھوٹی پھرتی ۔ ۔ ۔ جس تالاب پر پانی کو جاتی۔ سب مویشی وہاں سے بھاگتے۔ تب یوں ٹھہرا دیا۔ کہ ایک دن پانی پر وہ

جائے۔ ایک دن اوروں کے مویشی جائیں۔
سورہ شمس میں یہ قصّہ اس طرح بیان کیا ہے۔

فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا۔ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا
فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا (شمس ۔ ۱۳-۱۴)

پھر کہا ان کو اللہ کے رسول نے۔ خبردار رہو اللہ کی اونٹنی سے
اور اس کے پینے کی باری سے۔ پھر انہوں نے اس کو جھٹلایا۔
پھر وہ کاٹ ماری اور پھر الٹا مارا۔ ان پر ان کے رب نے
ان کے گناہ سے پھر برابر کر دیا۔ (جلالین)

بھلا یہ اونٹنی کیا ہوئی! پتھر سے نکلی۔ اور اس کا حق یہ کہ جس
دن وہ پانی پیئے۔ اور جانور پانی نہ پئیں! آخر اللہ میاں کی جو ہوئی۔
یہی خیر گزری۔ کہ کوئی انسان پتھر سے نہ نکلا۔ نہیں تو انسانوں کے لئے
پانی کا کال ہوتا۔ کوئی پوچھے۔ اس معجزے سے انسان کا کیا بنا ہے اور
رحمٰن کا کیا؟

۵۔ حضرت نوح

ہزار برس کے قریب جیئے

سورہ عنکبوت میں حضرت نوح کا ذکر ہوا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ
اِلَّا خَمْسِينَ عَامًا ط (عنکبوت ۔ ۱۴)

اور ہم نے بھیجا نوح کو اُن کی قوم پاس۔ پھر رہا ان میں ہزار
برس۔ پچاس برس کم۔
تفسیر حسینی میں اس آیت پر کہا ہے۔
نوح ع چہل سال مبعوث شد۔ و نہ صد و پنجاہ سال خلق را
بخدا دعوت کرد۔ بعد از طوفان شصت سال زیست۔ در احقاف
از وہب نقل کنند۔ کہ عمر نوح ع ہزار و چہار صد سال بود۔
صاحب عین المعانی فرمود۔ کہ سی صد و ہفتاد سال مبعوث شد۔
و نہ صد و پنجاہ سال دعوت کرد۔ بعد از طوفان سی صد و پنجاہ
سال زیست۔
نوح علیہ السلام چالیس سال کی عمر میں پیغمبر ہوئے۔ اور نو
سو پچاس سال لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے رہے۔ طوفان
کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔ احقاف میں وہب سے روایت
ہے۔ کہ نوح علیہ السلام کی عمر ایک ہزار چار سو سال تھی مصنف
عین المعانی فرماتے ہیں۔ کہ تین ہزار ستر سال کی عمر میں پیغمبر ہوئے۔
نو سو پچاس سال دعوت کی۔ اور طوفان کے بعد تین ہزار پچاس
سال زندہ رہے۔
حضرت نوح کی عمر کچھ ہو ان کی دعوت کا عرصہ تو پچاس سال
خود قرآن میں مذکور ہے۔ اس دعوت کا اثر یہ کہ معدودے چند
ساتھیوں کے سوا کوئی سیدھے راستے پر نہ آیا۔ اور سب کو
طوفان کی نذر ہونا پڑا۔ ساری مخلوق اللہ کی بنائی اور بنائی بھی
ویسی جیسی اللہ کو منظور۔ اللہ نے بعض کو جنت کے لئے بعض کو

دوزخ کے لئے پہلے سے ہی منتخب کر لیا تھا۔ پھر حضرت نوح کو اتنی تکلیف دینے کی ضرورت کیا؟ دی تھی۔ تو کچھ پھل ہوتا۔

۶۔ حضرت محمد

چاند توڑ دیا

حضرت محمد نے معجزہ دکھانے سے انکار تو کیا تھا۔ مگر پھر پیروؤں کے اصرار سے مجبور ہو گئے۔ سورہ قمر میں آیا ہے۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ○

نزدیک آ گئی قیامت اور پھٹ گیا چاند۔ (چاند کے دو ٹکڑے ہونا حضرت کا معجزہ ہوا۔ جس کا کافروں نے مطالبہ کیا تھا۔ آپ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دو ٹکڑے ہو گیا)

کوئی سوال کر سکتا ہے۔ کہ وہ چاند عرب کا یا اس معجزے کے دیکھنے والوں کا خاص تھا؟ یا یہی چاند تھا۔ جو عالم کی تمام اقوام کے لئے عام ہے؟ اگر عام تھا۔ تو کیا وجہ۔ کہ عرب کے باہر کے لوگ اس معجزے کے شاہد نہ ہوئے؟ آخر یہ واقعہ علم نجوم کی تاریخ میں کچھ کم اہمیت کا نہ تھا۔ کہ حضرت محمد کے داغ لگا دوام کے سوا کسی کی توجہ کو اپنی طرف نہ کھینچتا۔ اپنا اپنا مقدر ہے۔ اس سعادت سے اور فیضیاب نہ ہوتے!

سورہ بنی اسرائیل میں کہا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط

(سورہ بنی اسرائیل - ۱)

پاک وہ ذات کہ اپنے بندے (محمد) کو رات میں مسجد حرام (یعنی مکہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) کی طرف لے گیا ...... جس کی ہر طرف سے ہم نے برکت دی ...... کہ اُس کو قدرت کی عجائبات اور نشانیاں دکھلائیں ...... (آپ کی ملاقات پیغمبروں سے ہوئی - اور آپ کو آسمانوں کی طرف چڑھایا ...... تحقیق حضرت صلعم نے فرمایا - کہ میرے پاس براق لایا گیا - اور وہ ایک سفید جانور ہے - گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا - اس کا قدم وہاں تک پڑتا ہے - جہاں تک اس کی نظر پہنچے - سو میں اس پر سوار ہوا - وہ مجھ کو لے گیا - یہاں تک کہ میں بیت المقدس میں پہنچا - وہاں میں نے اپنی سواری کو اس حلقے میں باندھا - جس میں اور پیغمبر اپنی سواریاں باندھتے تھے ......) (جلالین)

اس کے بعد آسمانوں پر جانے کا ذکر ہے - دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے - سوال ہوتا ہے - کون ؟ حضرت جبرئیل فرماتے ہیں - حضرت محمد - پوچھا جاتا ہے - کیا وہ پیغمبر ہو گئے ؟ جواب مثبت ملنے پر دروازہ کھول دیا جاتا ہے - اس طرح مختلف آسمانوں پر مختلف انبیاء کرام کی زیارت کے بعد

پھر میں پہنچا سدرۃ المنتہےٰ تک - اس کے پتے ایسے جیسے ہاتھی کے کان - اور اس کے پھل ایسے جیسے مٹکا - جب اس بیری کے

کے درخت کو گھیر لیا۔ امر الہی سے اس چیز نے جس نے گھیر لیا۔
وہ متغیر ہو گیا۔ . . . . آپ نے فرمایا۔ میری طرف جو وحی ہوئی
وہ قابل اظہار نہیں۔" (بجلالین)

حضرت کی امت پر پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ حضرت واپس لوٹے۔ مگر انبیاء کرام نے سمجھایا۔ کہ یہ بوجھ پیروؤں سے برداشت نہ ہو سکے گا۔ حضرت بار بار حضور خدا میں گئے۔ اور وہاں سے لوٹے۔ آخر نمازوں کی تعداد پانچ کرا لی۔ حضرت موسیٰ نے اس میں بھی تخفیف کرانے کی صلاح دی۔ تو فرمایا۔

"میں بہت دفعہ اپنے رب کے پاس جا چکا ہوں۔ اب مجھ کو شرم آتی ہے۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا۔ اور یہ لفظ مسلم کے ہیں۔" (جلالین)

اس میں شک نہیں۔ کہ اس اعجازی سفر کی تفصیلات تفسیروں میں مرقوم ہیں۔ خود قرآن میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک ایک رات میں جانا ذکر کیا ہے۔ وہ اس وقت معجزہ تھا۔ لیکن آج غباروں اور ایروپلینوں کا زمانہ ہے۔ اس وقت اسے کون معجزہ قرار دے سکتا ہے؟

معجزات اور بھی بہت سے ہیں۔ لیکن یہاں بمثل مشتے نمونہ از خروارے۔ فقط بعض منتخب کر لئے ہیں۔ ناظر کے لئے غور طلب یہ ہے۔ کہ کیا ان معجزات سے پرماتما کی کسی خاص طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو کائنات کی کل کے معمولی طور پر چلانے سے ہونا مشکل ہے؟ کیا ان معجزات سے پرماتما کے پیاروں کی کسی خاص فضیلت کا اظہار

ہوتا ہے۔ جس سے ان کا رتبہ عقلمندوں کی نظر میں اونچا ہو؟ کہیں ان خارقِ عادت افعال سے یہ تو ظاہر نہیں ہوتا۔ کہ قدرت کا قانون بیداد نگری کا سا قانون ہے۔ جو توڑا مروڑا جا سکتا ہے۔ یہاں اعمال کی اتنی پرواہ نہیں جتنی اپنے منظورانِ نظر کی عزت اور ہتک کی ہے۔ لوگوں نے ایک ہادی کا کہنا نہیں مانا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ ہادی خود اخلاق کے اعتبار سے کیسا ہے۔ لوگوں کے لئے خون کی بارش۔ طوفانِ نوح اور نہ جانے کیا کیا تیار ہے۔ لوگوں کو اپنا عقیدتمند بنانے کے لئے وسائل کیا استعمال کئے جاتے ہیں؟ شعبدے۔ ڈنڈے کو سانپ بنا دیا۔ کیا اسی کو دعوتِ حق کہتے ہیں؟ ان شعبدوں سے کہیں بڑی مہتم بالشان حقائق قدرت کے کارخانے میں روز ظہور پذیر ہو رہی ہیں کیا بغیر باپ کی اولاد ہو جانے میں پرماتما کی طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور ماں باپ دونوں سکے ہوتے اولاد کے پیدا ہو جانے میں پرماتما کا کوئی ہاتھ نہیں؟ بوڑھے کے بچہ ہو جانا اللہ کی نشانی ہے۔ اور جوان کے لڑکا ہونا پرماتما کی قدرت کی تردید ہے؟ اونٹنی نے حضرت صالح کی شخصیت میں کس بزرگی کا اضافہ کیا؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ پرماتما پر ایمان کا انحصار اگر روزمرہ کے معمولی قدرتی واقعات اور کوائف پر رکھو۔ تو آج بھی قائم رہیگا۔ کل بھی۔ اور جو کسی گذشتہ زمانے کے اعجازی قصوں پر دارومدار ٹھیری۔ تو جس زمانے کے لوگ کہانیوں سے اوپر اٹھ کر کوائف حاضرہ کے طالب ہوئے۔ جیسے آج کل ہیں

* اُس زمانے میں دہریہ پن ہی دہریہ پن کا رنگ بیٹھ جائیگا۔ انسان اخلاق سے گر سکتا ہے اور پرماتما اپنے قانونوں کی پختگی سے۔ جیسے نہ اس کے اپنے توڑ سکیں اور نہ غیر *

نزولِ قرآن

جو لوگ پرماتما کے قائل ہیں۔ اور اس میں ہدایت کی صفت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے لئے الہام پر ایمان لانا لازم ہے۔ پرماتما نے اپنے قوانین کا انکشاف کارخانہ عالم کے فعل فعل میں کیا ہے۔ ان قوانین کا جتنا علم انسان کو ہوتا ہے۔ اُتنا وہ قدرت کی نیرنگیوں سے جو طبعاً اس کا رزق ہیں۔ فیضیاب ہو سکتا ہے۔ انسان کی طبیعت کا ایک خاصہ ہے۔ کہ اسے علم سکھانے سے آتا ہے۔ بے سکھائے یہ جاہل رہتا ہے۔ اکبر کے متعلق یہ روایت ہے۔ کہ اُس نے چند نوزائیدہ بچے ایک سنسان جگہ میں جمع کرا دیئے تھے۔ اور محض گونگوں کو ان کی پرورش پر مقرر کیا تھا۔ وہ بچے بڑے ہو کر اپنی گونگی زبانوں سے فقط وہی آوازیں نکالتے تھے۔ جو انہوں نے گونگے انسانوں اور بے زبان جانوروں کے مُنہ سے سُنی تھیں۔ بعض جنگلی اقوام جو کسی سبب سے ایک دفعہ وحشیانہ حالت کو پہنچ گئی ہیں۔ خود بخود کوئی ذہنی ترقی کرتی معلوم نہیں ہوتیں۔ جب تک دیگر مہذب اقوام ان میں رہ کر انہیں تہذیب کی تعلیم نہ دیں۔ وہ تہذیب سے بے بہرہ رہتی ہیں۔ افریقہ کے بعض گروہ صدیوں سے ننگے چلے آتے ہیں۔ یہی حالت وسط ہند کی کچھ پہاڑی قوموں

کی ہے۔ ہاں! ایک دفعہ ان اقوام کی زندگی کو پلٹ دو۔ پھر وہ ترقی
کی شاہراہ پر چل نکلتی ہیں۔ بچہ بھی علم کی ابتدا تو استاد کی تدریس سے
کرتا ہے۔ مگر ایک دفعہ پڑھنے لکھنے میں نکل کھڑا ہو۔ پھر ذہنی ترقی کا
نامتناہی میدان اس کے سامنے آ جاتا ہے۔

حضرت انسان اس وقت بہت سے علوم کا مالک ہو رہا ہے۔ حکما
کے سامنے یہ سوال اکثر آتا رہا ہے۔ کہ ان علوم کی ابتدا کہاں سے
ہوئی؟ انسانی ادراک کا اس کی بول چال سے بڑا تعلق ہے۔ شعور
کی ترقی زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ افراد اور اقوام دونو
جوں جوں اپنی زبان کا ارتقا کرتے ہیں۔ توں توں ان کے ذہنی قویٰ
کا نشو و نما بھی ہوتا جاتا ہے۔ دراصل علم کی ابتدا اور زبان کی ابتدا کا
سوال مشترکہ ہے۔ انسانی علم کا جو ابتدائی مخرج ہوگا۔ وہی انسانی
زبان کا بھی منبع مانا جائیگا۔

علم الاذہان اور علم اللسان کے ماہروں نے اس مسئلہ پر مدتوں بحث
کی ہے۔ پرماتما کے ماننے والے ہمیشہ اس عقیدہ کے قائل رہے ہیں۔
کہ زبان اور علوم کا ابتدائی ظہور بذریعہ کشف ہوا۔ پرماتما نے اپنے
پیاروں کے اذہان میں اپنے علم کا پرتوہ ڈالا۔ وہ ابتدائی علم تھا۔
ویدوں میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

यज्ञेन वाचः पदवीममायन्तामन्वविन्दन्नृषिषु प्रविष्टाम्॥ ऋ० १०।७१।३॥

معبود پرماتما سے (رشیوں نے) زبان کا راستہ پایا۔ اور رشیوں میں داخل ہوئی زبان
کو (لوگوں نے) بعد میں حاصل کیا۔ رگوید۔ ۱۰۔ ۷۱۔ ۳

اِس واقعے کی طرف اشارہ ہر ایک مذہبی صحیفے میں پایا جاتا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (سورہ بقر۔ ۳۱)

اور سکھائے آدم کو نام سب اشیا کے۔

یہ اور بات ہے۔ کہ ان آیات میں فرشتوں کا بھی ذکر ہے۔ ان سے اللہ تعالیٰ کلام کرتا ہے۔ اور آدم کو ان پر فضیلت دی ہے۔ کہ اسے اسمار سکھائے ہیں۔ فرشتوں کے ساتھ کلام کس طرح بغیر اسمار کے ہوتا ہوگا؟ یہ ایک معمّا ہے۔ یہ بھی جدا سوال ہے۔ کہ آدم کو یہ فضیلت عطا کرنے کی وجہ کیا تھی؟ اور فرشتوں کو اس سے محروم رکھنے کا بھی باعث کیا تھا؟ آدم کے بہشت سے نکالے جانے کی کہانی کسی گذشتہ باب میں بیان کی جاچکی ہے۔ اِس موقعہ پر یہ بھی فرمایا ہے۔

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (سورہ بقر۔ ۳۷)

پھر سیکھے آدم نے اپنے رب سے کلمات۔

بہر حال یہ ظاہر ہے۔ کہ قرآن میں الہام کا وجود ابتدائے آفرینش سے مانا ہے۔ کوئی پوچھ سکتا ہے۔ کہ جو اعتراض تم آدم کو الہام کی خاص فضیلت دیئے جانے کے متعلق کرتے ہو۔ کیا وہی اعتراض وید کے ملہمین کے بارے میں نہیں کیا جاسکتا؟ انہیں کیوں اس نعمت کے لئے مختص کیا گیا؟ ہم آفرینشوں کا سلسلہ ازلی مانتے ہیں۔ ہر جدید آفرینش میں گذشتہ آفرینش کے بہترین اشخاص ملہم بنائے جاتے ہیں۔ یہ ان کی اخلاقی اور روحانی برگزیدگی کا قدرتی ثمر ہوتا ہے۔ اس عقیدے میں مندرجہ بالا اعتراض کی گنجائش نہیں۔ اہلِ اسلام کو مشکل اس لئے

ہے۔ کہ وہ عدم سے وجود کا خلق مانتے ہیں۔ اب عدم کی حالت میں کوئی خاص استعداد بہم نہیں پہنچائی جا سکتی۔ جس کا خاص ثمر الہام ہو۔

تاہم اہل اسلام اس عقیدے کے قائل ہیں۔ کہ آدم نے اسماء اور بعد میں کلمات اللہ تعالیٰ سے حاصل کئے تھے۔ اس پر سوال یہ ہوگا۔ کہ کیا وہ علم انسانی ضروریات کے لئے کافی تھا؟ قرآن میں کہا ہے۔ کہ نام تمام اشیاء کے سکھائے گئے۔ بہرحال طبعیات۔ اخلاقیات۔ اور الہیات۔ یہ تمام علوم ان اسماء اور کلمات میں شامل ہونگے۔ کیونکہ آدم چاہیے۔ ارتقائے انسانی کے کسی درجہ پر پیدا کیا گیا ہو۔ اس کی ضروریات طبعی۔ اخلاقی اور الہیٰ سب طرح کی ہونگی۔

اہل اسلام کا ایک اور عقیدہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا علم لوح محفوظ میں رہتا ہے۔ سورہ بروج میں کہا ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔ (سورہ بروج - ۲۱)

بلکہ وہ قرآن مجید ہے بیچ لوح محفوظ کے۔

اس آیت کی تفسیر کے دوران میں تفسیر جلالین میں مرقوم ہے۔

اِس (لوح محفوظ) کا طول اس قدر جس قدر آسمان اور زمین کے درمیان فاصلہ ہے۔ اور اس کا عرض اس قدر جس قدر مشرق اور مغرب کی دوری اور بنا ہوا ہے۔ سفید موتی سے۔ (جلالین)

تفسیر حسینی میں لکھا ہے۔

و او در کنارِ فرشتہ است در یمینِ عرش

اور وہ ایک فرشتے کے بغل میں ہے۔ عرش کے دائیں طرف۔

اِسی لوحِ محفوظ کو دوسرے مقامات پر اُم الکتاب کہا ہے یعنی

کتابوں کی ماں ۔ دوسرے لفظوں میں تمام علوم کا مخزن ۔ اس عقیدے کے ہوتے یہ سوال بیجا نہ ہوگا ۔ کہ آیا حضرت آدم کی تعلیم اسی لوح محفوظ سے ہوئی تھی ۔ یا اس کے باہر سے ؟ آخر جب تمام اشیا کے نام حضرت کو سکھائے گئے ۔ اور اللہ میاں نے اپنی زبانی سکھائے ۔ تو وہ لوح محفوظ ہی تو پڑھا دی ہوگی ۔ دوسرے لفظوں میں ابتدا ہی میں مکمل الہام دیا ہوگا ۔ اگر ایسا کر دیا ۔ تو حضرت آدم کے بعد کوئی اور پیغمبر بھیجنے کی ضرورت نہیں رہتی ۔ مگر قرآن شریف میں آیا ہے ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۔

(سورہ بقر ۔ آیت ۸۷)

اور تحقیق دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور لائے پیچھے پیغمبروں کو ۔

وَاِذَا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ (سورہ زخرف ۔ آیت ۵۹)

اور جب آیا عیسیٰ ساتھ دلیلوں ظاہر کے ۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (سورہ نحل ۔ ۳۴)

اور تحقیق بھیجے ہیں ہم نے بیچ ہر اُمت کے پیغمبر ۔

یہی نہیں ۔ ان پیغمبروں اور ان کے الہام پر ایمان لانا اہل اسلام کے لئے ضروری بھی ہے ۔ چنانچہ کہا ہے ۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۔

(سورہ بقر ۔ آیت ۳)

جو ایمان لائے اس پر جو تجھ پر اُتارا گیا ۔ اور اُس پہ جو تجھ سے پہلے اُتارا گیا ۔

اب قابل غور یہ امر رہا۔ کہ اگر حضرت آدم کا الہام صحیح اور کامل تھا۔ تو اس کے بعد دیگر الہام کی کیا ضرورت پیش آئی؟ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے صحیفے آج کل بھی ملتے ہیں۔ انہیں سے حضرت محمد نے کام کیوں نہ چلا لیا؟ اس پر اہلِ اسلام دو طرح کی رائیں رکھتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حضرت آدم ارتقائے انسانی کی اولین منزل پر تھے۔ ان کے لئے جس قدر الہام کافی تھا۔ وہ اب ناکافی ہے۔ یہی حالت ان کے بعد آنے والے پیغمبروں اور ان پیغمبروں کے الہاموں کی ہے۔ اس مسلمہ پر ایمان رکھنے کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے۔ کہ قرآن کو بھی آخری الہام تسلیم نہ کریں۔ کیونکہ اگر انسانی ارتقا صحیح ہو۔ تو اس کا حضرت محمد کے وقت یا اس کے بعد آج تک بھی اختتام تو ہو نہیں گیا۔ پھر یہ کیا۔ کہ الہام کا سلسلہ جو ایک مفروضہ سلسلہ ارتقا کے ساتھ ساتھ جاری کیا جائے۔ وہ کسی خاص درجہ پر پہنچ کر مؤخر الذکر سلسلہ کا ساتھ چھوڑ دے۔ درحقیقت یہ ارتقا کا خیال اہل اسلام کا ابتدائی خیال نہیں۔ یہ خیال انہیں اب سوجھا ہے۔ جو لوگ اس مسئلہ کے قائل ہیں۔ انہیں مذہبی ارتقا کے مسئلے کے دیگر لوازمات پر بھی غور کرنا ہوگا۔ مذہبی ارتقا کے معنی یہ ہیں۔ کہ پہلے انسان بے مذہب تھا۔ یا کم سے کم کثیر خداؤں کا قائل تھا۔ بے جان اجسام کو پوجتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ بذریعہ ارتقاء توحید کا قائل ہوا۔ لیکن قرآن میں ہر ایک پیغمبر کے الہام کا توحید الٰہی ایک لازم جزو مانا گیا ہے۔ ہر ایک پیغامبر اپنے پیغام میں یہ مسلمہ ضرور سناتا ہے۔ حضرت موسیٰ کا یہ پیغام منجملہ دیگر آیات کے سورہ طٰہٰ آیت ۵۰ میں درج ہے۔ حضرت عیسیٰ کا سورہ مائدہ آیۃ

۱۱۱ میں ۔حضرت یوسف کا سورہ یوسف ۔آیت ۱۰۱ میں ۔ اسی طرح دیگر پیغمبران کے متعلق بھی حوالہ جات دیئے جا سکتے ہیں ۔ قرآن کے پڑھنے والے ان بیانات سے واقف ہیں ۔ ان سب پیغامات کا لازم اور غالب عنصر توحید ہے ۔ اہل اسلام کا یہ بھی دعوٰی ہے ۔ کہ اسلام کی تعلیم کا سب سے بڑا قابل ستائش عنصر توحید الٰہی ہے ۔ اگر وہ عنصر اس سے پہلے کے الہام میں صریحاً موجود تھا ۔ تو پھر اہل اسلام کے نقطۂ نظر سے مذہبی ارتقا کے کوئی معنے نہیں رہتے ۔ درحقیقت الہام اور ارتقا دو متضاد عقیدے ہیں ۔ اگر ذہنی ارتقا سے مذہب میں ترقی ہوتی ہے ۔ تو الہام کی ضرورت کیا ؟ اہل اسلام کا ایک اور مسلمہ یہ ہے ۔ کہ بیشتر کے الہاموں میں رد و بدل ہوتی رہی ہے ۔ بعض الہامی کتب تو کلاً معدوم ہو چکی ہیں ۔ اور بعض میں تحریف راہ پا گئی ہے ۔ چلو بحث کے لئے مان لو ۔ کہ ایسا ہوا ۔ اب سوال یہ ہوگا کہ آیا وہ کتب آسمانی تھیں یا نہ تھیں ؟ تھیں اور اسی پرماتما کی دین تھیں ۔ جس کی دین قرآن ہے ۔ تو کیا وجہ کہ وہ کتب اپنی اصلی حالت میں قائم نہ رہیں ۔ اور قرآن رہ گیا یا رہ جائے گا ؟ تحریف ہو جانے میں قصور یا انسانوں کا ہے یا (نعوذ باللہ) اللہ میاں کا ۔ اب انسان بھی وہی ہیں ۔ اور اللہ میاں بھی وہی ۔ کس کی خصلت وقت پا کر بدل گئی ہے ۔ کہ آئندہ صحیفوں کو ان کو ائف سے محفوظ کیا جائیگا ۔ جن کا شکار گذشتہ صحیفے ہوتے رہے ؟ اہل اسلام کا عقیدہ ہے ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ اپنے اوپر لیا ہے ۔ پوچھنا ہوگا ۔ کہ پہلی کتب کے متعلق یہ ذمہ کیوں نہ لیا گیا ؟ کیا اللہ میاں

کی عادات تجربہ سے بدلتی ہیں؟ یا پہلے دیدہ و دانستہ غفلت برتی گئی؟
دونوں صورتوں میں اللہ میاں کی ذات پر حرف آتا ہے۔ قرآن کو
عیب سے بچانے کے لئے اللہ میاں پر عیب وارد ہونے دینا اہل
اسلام کے لئے دانائی نہیں۔ یا تو اللہ میاں کے علم میں نقص ماننا پڑتا
ہے۔ یا ارادے میں۔ دونوں ناخوش آئند صورتیں ہیں دونو کفر ہیں۔
بات یہ ہے۔ کہ ابتدائے آفرینش میں الہام کا قائل ہونے کے
بعد کسی بھی بعد کے الہام کو تسلیم کرنا اجتماع ضدین کا مرتکب ہونا ہے
الہام اور اس میں ردو بدل؟ الہام اور اس میں تحریف؟ الہام ایک
ہو سکتا ہے۔ وہ کامل ہوگا۔ جیسا پرماتما کامل ہے۔ ذہنی ارتقا
کا مسئلہ آئے دن کی تاریخی دریافتوں سے رد ہو رہا ہے۔ ہر ایک
براعظم میں پرانے کھنڈرات کی کھدائی سے ثابت ہو رہا ہے۔ کہ
موجودہ پود سے صدیوں پہلے ہر جگہ ایسی نسلیں رہ چکی ہیں۔ جو تہذیب
اور تمدن کے میدان میں موجودہ مہذب قوموں سے اگر بہت آگے
نہ تھیں۔ تو پیچھے بھی نہ تھیں۔ اس دریافت کا لازمی نتیجہ مذہب کے
میدان میں یہ یقین ہے۔ کہ الہام شروع ہی میں مکمل صورت میں
آیا تھا۔ اگر پرماتما اپنے کسی الہام کا محافظ ہے۔ تو اس ابتدائی الہام
کا بھی پورا محافظ ہونا چاہئے تھا۔ اس کے علم اور حکم میں تنسیخ و تحریف
کی گنجائش نہیں۔

قرآن کے الہام ہونے پر ایک اور اعتراض یہ وارد ہوتا ہے۔
کہ یہ عربی زبان میں آیا ہے۔
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ط (سورہ رعد ۳-۲۳)

اور یہ اُتارا ہم نے حکم عربی میں

کیا عربی زبان لوح محفوظ کی زبان ہے؟ اگر ہے تو اُسے اقوام انسان کی پہلی زبان ہونا چاہئے تھا۔ جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ دُوسری زبانوں کے الفاظ کے مخرج' عربی زبان کے الفاظ کو کوئی علم الالسنہ کا ماہر قرار نہیں دیتا۔ اور پھر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو عبرانی زبان میں الہام مِلا تھا۔ اگر وہ بھی لوح محفوظ کی نقل تھی۔ تو لوح محفوظ کی ایک زبان نہ رہی۔ اُم الالسنہ عربی کی جگہ عبرانی کو ماننا پڑیگا۔ مگر ثبوت نہ عبرانی کے ابتدائی زبان ہونے کا ہے۔ اور نہ عربی زبان کے۔ اگر قرآن کا الہام تمام اقوام انسان کے فائدے کے لئے ہوتا۔ تو اس کی زبان ایسی ہونی چاہئے تھی۔ کہ ساری دُنیا کے لوگوں کو اس کے سمجھنے میں برابر آسانی ہو۔ کسی کا خیال ہو۔ کہ دوسری اقوام ترجمہ سے فائدہ اُٹھا سکتی ہیں تو عرض یہ ہے۔ کہ ترجمہ اور اصل عبارت میں ہمیشہ فرق رہتا ہے۔ جو لوگ الہام لفظی کے قائل ہیں۔ ان کے لئے الہام کے اصل الفاظ ہمیشہ معانی کی کان بنے رہتے ہیں۔ جن کی جگہ اور تو اور۔ اسی زبان کا ترجمہ بھی نہیں لے سکتا۔ عربی الہام قرآن کے وقت بھی تو تمام دُنیا کی زبان نہ تھی۔ جیسے وید کی زبان ابتدائے آفرینش میں تمام اقوام انسان کی زبان تھی۔ اور اہل عالم کی مروّجہ بولیاں وید کی زبان سے مشتق ہیں۔ ماہران علم الالسنہ کی یہ رائے ہے۔ کہ ملت انسان کے کتب خانہ میں وید سب سے پرانی کتاب ہے۔ (میکس مولر) اور اس کی زبان مروجہ زبانوں کی ماں ہے۔ درحقیقت قرآن کا اپنا ابتدائی منشا صرف اقوام عرب کی اصلاح کرنا تھا۔ چنانچہ خود قرآن میں آیا ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ

(سورہ سجدہ - ع-۱)

تا ڈرادے تو اس قوم کو کہ نہیں آیا ان کے پاس ڈرانے والا تجھ سے پہلے۔ تاکہ وہ ہدایت پکڑلیں۔

یہ قوم اہل عرب ہیں۔ حضرت محمد کے سامنے عیسائیوں اور یہودیوں کا دعویٰ تھا۔ کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ اور پیغمبروں کے پیرو ہیں۔ اہل عرب یہ دعویٰ نہ کر سکتے تھے۔ حضرت محمد کے طفیل ان کی یہ حسرت بھی پوری ہو گئی۔ کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ حضرت کے ظہور سے پہلے کیا اہل عرب کو بغیر ہدایت کے رکھا گیا؟ قرآن شریف کی عبارت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا ہے۔

اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا

(سورہ سجدہ - ع-۱)

اُتارا ہم نے تجھ پر قرآن عربی زبان کا۔ کہ تو ڈر سنائے بڑے گاؤں کو۔ اور اس کے آس پاس والوں کو۔

بڑے گاؤں سے مراد' ہر تفسیر کے مطابق 'مکہ' ہے۔ اہل عرب جن میں حضرت محمد کا جنم ہوا۔ ان کے لئے مکہ سب سے بڑا گاؤں تھا۔ حضرت کے سپرد قرآن کے لفظوں میں یہ خدمت کی گئی۔ کہ وہ مکہ اور اس کے قرب و جوار میں اسلام کی اشاعت فرمائیں

دوسری اُمتوں کے لئے تو اور پیغمبر آ چکے تھے۔ اہل عرب کے لئے الہام کی ضرورت تھی۔ سو حضرت کے پیغام سے پوری ہو گئی۔ قرآن کی مندرجہ بالا آیتوں کا اگر کوئی مطلب ہے۔ تو یہی۔

قرآن کا عقیدہ تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ مذہب ہر قوم کا جدا جدا ہے۔ اور یہ اہل اسلام کی زبردستی ہے۔ کہ جو مذہب عرب کے لئے مخصوص ہے۔ اسے دیگر ممالک میں جو اسے موافق نہیں آتے۔ خواہ مخواہ اشاعت دے رہے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ (الحج۔ رکوع ۹)

واسطے ہر اُمّت کے بنائی طرح عبادت کی اور وہ عبادت کرتے ہیں اُس کو۔

یہی نہیں۔ ہمارے اس اعتراض کو کہ پرماتما کا انصاف تقاضا کرتا ہے۔ کہ وہ اپنا الہام ایسی زبان میں عطا کرے۔ جس کے سمجھنے میں تمام بنی نوع انسان کو برابر سہولت ہو۔ خود قرآن شرف قبولیت بخشتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراہیم ۴)

اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی پیغمبر مگر ساتھ زبان قوم اپنی کے۔

قرآن کا یہ منشا کہ وہ فقط اہل عرب کے لئے مخصوص ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت سے کیونکر بیان کیا جا سکتا ہے۔

وقت پا کر منسوخ ہو جانے کی شہادت بھی خود قرآن میں موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ۔ (بنی اسرائیل ۶)

اور اگر ہم چاہیں۔ لے جائیں وہ چیز کہ وحی کی ہے ہم نے طرف تیری

در اصل اہل اسلام کے عقیدہ الہام کے منطقی نتائج کا قائل خود نہیں ہے۔ اگر یہ مان لو۔ کہ ابتدائی الہام کے بعد پھر الہام ہونے

کی گنجائش ہے۔ تو یہ بھی ماننا پڑیگا۔ کہ کوئی الہام کامل نہیں ہوتا۔ خواہ پہلا الہام اپنے عقیدت مندوں کی بے پروائی سے تلف ہو جائے۔ خواہ ان کی بدنیتی سے اس میں تحریف راہ پا جائے۔ ہر الہام میں اس کی برابر گنجائش رہیگی۔ کیونکہ انسان اور پرماتما جن دو کے درمیان الہام کا رشتہ ہے۔ وہ ہر زمانے میں ایک سے رہتے ہیں۔ پرماتما اگر پہلے الہام کا ضامن نہیں ہوا۔ تو کسی دوسرے کا بھی نہ ہوگا۔ اگر ایک حکم کے منسوخ ہو جانے کا امکان ہے۔ تو اس کے بعد آنے والے دیگر الہام بھی اس امکان سے بری نہیں ہو سکتے۔ ہم حیران ہیں۔ کہ اللہ میاں کے حکم کے منسوخ ہونے کا امکان ہو ہی کیوں؟ مولانا لوگ ایک تمثیل دیتے ہیں۔ کہ جب ایک جماعت کے طلبا جوں جوں استعداد میں ترقی کرتے ہیں۔ توں توں ان کے درس کی کتب میں بھی تبدیلی کی جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت آدم کے زمانے کے لوگ گویا پہلی جماعت کے طالب علم تھے۔ اب کے لوگ اعلیٰ جماعتوں میں آ چکے ہیں۔ ان کے لئے الہام پہلے کی نسبت اعلیٰ ہونا چاہئیے۔ ہم اس دلیل کا جواب اوپر دے چکے ہیں۔ کہ قرآن کا سب سے اعلیٰ حکم توحید الٰہی کے متعلق ہے۔ اور وہ پہلے پیغمبروں کے الہام میں بھی خود قرآن کے الفاظ میں موجود ہے۔ پھر وہ کونسا نیا سبق ہے۔ جو قرآن ہی کے لئے مخصوص تھا؟ یہاں اس تمثیل کا جواب ہم دلیل سے دیں گے۔ وقت گزرنے کے ساتھ درس کی کتب بدلنے کی ضرورت اُس وقت پیش ہوتی ہے۔ جب طالب مختلف درجات میں ایک رہیں۔ وہی جماعت ترقی کرتی کرتی آگے بڑھتی جائے۔ تو انہیں واقعی ہر درجہ میں نئی

تعلیم دینی ہوگی۔ اگر اہلِ اسلام تناسخ کے قائل ہوتے۔ کہ اس وقت بھی وہی انسان حیطۂ حیات میں ہیں۔ جو حضرت آدم کے وقت تھے۔ تو شاید اس لحاظ سے نسخ کی ضرورت قرینِ قیاس ہوتی۔ لیکن اہل اسلام کے عقیدے کے مطابق ہر نسل نئی خلق کی جاتی ہے۔ ہر نسل اپنے سے پہلی نسل کے علم سے ویسی ہی بے بہرہ ہوتی ہے۔ جیسی خود پہلی نسل شروع شروع میں تھی۔ اسے نیا سبق پڑھانے کے کیا معنے؟ حق یہ ہے۔ کہ جیسا ہم اوپر عرض کر چکے ہیں۔ الہام اور ارتقا دو متضاد مسلے ہیں۔ الہام ماننے والوں کو شروع ہی میں مکمل الہام کا نزول تسلیم کرنا ہوگا۔ شروع میں زبانوں کے اختلاف کا جھگڑا بھی نہیں اُٹھتا۔ چنانچہ خود قرآن شریف میں کہا ہے

وَمَا كَانَ النَّاسَ اِلَّآ اُمَّت وَاحِدہ ٥ فَاخْتَلِفُوْ (یونس۔ ع۲)

اور لوگ جو ہیں سو ایک ہی امت ہیں پیچھے جدا ہوئے۔

اس وقت کے الہام سے بھی اہل اسلام قائل ہیں۔ اور وہ الہام خود قرآن کے لفظوں میں۔

وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ ٥ (زخرف۔ ع۱)

اور وہ ہے بیچ ام الکتاب کے۔ بلند قدر حکمت بھرا۔

"بلند قدر حکمت بھرا" لفظی ترجمہ ہے۔ اصطلاح 'وید بھگوان' کا۔ وید کے معنے حکمت بھرا۔ اور بھگوان کے معنے بلند قدر۔

مذاہب کے باہمی مخاصمات کی ایک وجہ یہ ہے۔ کہ نیا مذہب پُرانے مذہب کو منسوخ کہہ کر اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اور پرانا مذہب نئے مذہب کو بے وجہ بدعت قرار دیتا ہے۔ نئے پیغمبر کے اپنے دعوے

کے سوا اس کے پیغام کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت بھی کیا ہے؟ خود قرآن میں کئی مدعیان نبوت کی طرف اشارہ ہے۔ کہا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْہِ شَیْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ۔

(سورہ انعام۔آیت ۹۸)

اور اس آدمی سے زیادہ ظالم کون ہے۔ جو اللہ پر بہتان باندھتا ہے اور کہتا ہے۔ میری طرف وحی کی گئی۔ لیکن وحی اس کی طرف نہیں کی گئی۔ اور کہتا ہے۔ میں بھی اُتارتا ہوں مثل اس کے جو اللہ نے اُتارا۔

مفسروں نے اس عبارت کا اشارہ مسیلمہ اباطیل اور ابن علیسیٰ کی طرف مانا ہے۔ کہ انہوں نے حضرت محمد کے حین حیات میں پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا اب اہل عالم کے پاس کونسی پہچان ایسی ہے۔ جس سے سچے پیغمبر اور جھوٹے مدعی نبوت میں تمیز کریں؟ دونوں اپنے آپ کو منجانب اللہ کہتے ہیں۔ قرآن کو الہامی کتاب نہ ماننے والوں کو خود قرآن کی آیتوں میں بہت سرزنش و توبیخ کی ہے۔ ان پر لعنتیں برسائی ہیں۔ اور پرانی اُمتوں کے قصے سنا سنا کر ڈرایا ہے۔ کہ جس کیفر کردار کو سابقہ پیغمبر کو نہ ماننے والے پہنچائے گئے تھے۔ وہی حال تمہارا ہوگا۔ یہی بات مسیلمہ اباطیل اور ابن علیسیٰ اپنے دعویٰ کردہ الہام میں کہتے ہونگے۔ اس لئے یہ دھمکیاں بھی قرآن کے الہامی ہونے کی دلیل نہیں۔ ممکن ہے۔ کوئی مسیلمہ اباطیل اور ابن عیسیٰ کی کتب کے ضائع ہوجانے اور قرآن کے بچ رہنے کو قرآن کی فضیلت کا نشان بتلائے۔ سو باقی تو ایسی کتابیں بھی ہیں۔ جو اخلاق سوز ہیں۔ جن کا ادبی ثمر فقط بد اخلاق تنگ مجلس لوگوں کی ضیافت طبع ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ

ان کتابوں کی تہ میں الہام الہٰی ہے۔ قرآن میں اپنے متعلق ایک یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (سورہ بقر۔ آیت ۲۴)

اور اگر تم شک میں ہو اس سے جو اُتارا ہم نے اوپر بندے اپنے کے۔ پس لاؤ ایک سورہ مثل اس کے۔ اور بلاؤ اپنے شاہدوں کو سوا اللہ کے اگر تم ہو سچے۔ پھر اگر نہ کرو۔ اور نہ کر سکو گے۔

اس آیت کا اقتباس ہم کسی گزشتہ باب میں کر چکے ہیں۔ کوئی شخص اپنی تحریر کے متعلق یہ دعویٰ کرے۔ کہ اس جیسی تحریر نہیں ہو سکتی۔ اور بالفرض اس جیسی تحریر اس کے زمانہ میں کوئی نہ بنا سکے۔ تو کیا اس کے بے نظیر ہونے کی بنا پر ہی اسے منجانب اللہ مان لیا جائیگا؟ اگر ایسا ہو۔ تو ہر زمانے کا سب سے بڑا انشا پرداز اور شاعر ضرور نبی سمجھا جایا کرے الہام الٰہی ہونے کی یہ بھی کوئی منطقی دلیل نہیں۔ تاہم اب ہم اس دعویٰ میں متذکرہ بے نظیری کی ماہیت پر غور کر لینا چاہتے ہیں۔ کیا یہ بینظیری فصاحت کے لحاظ سے ہے۔ جیسا مولانا ثناء اللہ صاحب کا خیال ہے؟ سر سید احمد۔ جیسا ہم اس کتاب کے آخری باب میں ظاہر کریں گے۔ قرآن شریف کی فصاحت کے لحاظ سے بے نظیری کے قائل نہ تھے یہی حالت علامہ شبلی نعمانی کی تھی۔ خود قرآن کی تفسیروں میں ایک تفسیر مولانا فیضی کی ہے۔ جس کا نام سواطع الالہام ہے۔ وہ ساری بے نقط ہے۔ انشاپردازی کا یہ بھی تو کمال ہے۔ کہ ایک کتاب ساری کی ساری بے نقط

لکھ دی جاتی - کیا اس لئے کہ اس بے نقط تفسیر جیسی اور کتاب لکھنا مصنفوں کو مشکل ہے - اس تفسیر کو الہام الہٰی تصور کیا جائے؟ اس دعوٰی کے متعلق سورہ لقمان کی آیت ۳ پر تفسیر حسینی کا حاشیہ حسب ذیل ہے :-

آوردہ اند - کہ نضر بن حارث لعن اللہ علیہ بہ تجارت بہ بلاد فارس آمدہ بود - وقصہ رستم و اسفندیار بخرید و معرب ساختہ بمکہ برد - و گفت اینک افسانہ آوردہ ام - شیرین تر از افسانہائے محمد " " "

معالم التنزیل میں بھی قصہ سورہ لقمان آیت ۳ کے متعلق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے -

یترکون استماع القران

انہوں نے قرآن سننا چھوڑ دیا -

پس انشا یا فصاحت کا کمال بھی کسی کتاب کے الہامی ہونے کی فیصلہ کن دلیل نہ ہوا - اس دعوٰی پر فرقہ بندی ہونے کا احتمال ہے - اور جب یہ مسلمہ ہر فریق کا ہے کہ ابتدائے آفرینش میں وحی منجانب اللہ ہوئی تھی - اور وہی انسانی علوم کا ابتدائی منبع ہے - تو اس پر خواہ مخواہ کے نسخ اور تحریف کے اتہام نہ لگا کر - جو کلام الہٰی کی بے وجہ بے ادبی ہے - اسی ابتدائی الہام پر سب کو مجتمع ہو جانا چاہئے - وہ الہام وید ہے - یہ الہام لوح محفوظ میں ہے - یعنی اس کی ازلی ابدی حفاظت کی گئی ہے - چنانچہ مغربی علما کی بھی جنہوں نے وید کا مطالعہ کیا ہے - یہی رائے ہے - کہ وید میں تحریف نہیں ہوئی - پروفیسر میکس مولر اپنی رگوید سنہتا حصہ اول دیباچہ صفحہ ۲۷ پر لکھتے ہیں -

ہم اس وقت جہاں تک جانچ سکتے ہیں۔ ہم ویدوں کے سوکتوں میں مختلف فرنوں کے ہونے کا اس لفظ کے مروجہ معنوں میں ذکر نہیں کر سکتے۔

پروفیسر اے۔ اے میکڈانل اپنی 'تاریخ ادب سنسکرت' کے صفحہ ۵۰ پر لکھتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس (وید) کی حفاظت ایسی صحت کے ساتھ ہوئی ہے۔ جو تاریخ ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔

قرآن نے اپنے متعلق تو کہہ دیا۔ کہ اسے واپس بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہ زبانِ عربی میں ہے۔ ایک ایسی قوم کے لئے ہے۔ جس میں پہلے پیغمبر نہیں آیا اس کا مقصد مکہ اور اس کے گرد و نواح کی عارضی اصلاح ہے۔ اور یہی سوامی دیانند اور اُن کے پیروؤں کا دعویٰ ہے۔ ام الکتاب جس کو وید نے اپنی اعجاز بھری زبان میں 'وید ماتا' کہا ہے۔ وُہی وید ہے۔ جو ابتدائے آفرینش میں دیا گیا تھا۔ اور جو سب طرح کی آلائشوں آمیزشوں اور تخفیفوں سے پاک رہا ہے۔ بہرحال کوئی یہ کیونکر تسلیم کر سکتا ہے۔ کہ کتابوں کی ماں کی پیدائش تو پیچھے ہوئی۔ اور لڑکیاں اس سے پہلے اپنی زندگی گزار چکی تھیں؟

الہام کے متعلق ہمارا مسلمہ یہ ہے۔ کہ پرماتما رشیوں کے دلوں میں اپنے علم کا انکشاف کرتا ہے۔ یہی ایک طریقہ وحی کا ہے۔ پرماتما ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ اس کے اور اس کے پیاروں کے درمیان کسی قاصد کی ضرورت نہیں۔ مگر قرآن کا الہام ایک فرشتے کے ذریعہ ہوا ہے۔ جس نے حضرت محمد سے پہلی ملاقات کے دوران میں کہا تھا۔

اقرا باسم ربك

پڑھ نام سے اپنے رب کے۔

دوسرے لفظوں میں قرآن کی تعلیم ذہن کے ذریعہ نہیں۔ زبان کے ذریعے دی گئی۔ یہ الہام ذہنی نہیں۔ زبانی ہے۔ حضرت محمد صاحب کو تو جبریل کی زبان سے الہام ملا۔ حضرت جبریل کو کس کی زبان سے ملا ہوگا؟ اللہ میاں تو محیط کل ہے۔ اس کے عضو ہو نہیں سکتے۔ سوامی دیانند بجا سوال فرماتے ہیں۔ کہ ابتدا میں الف۔ ب کی تعلیم کس نے دی تھی؟ مراد یہ کہ اگر الہام زبان کے تلفظ سے شروع ہوتا ہے۔ اور خود الہام دینے والا مدرس بن کر پہلے ان الفاظ کا تلفظ کرتا ہے جو اس کے بعد ملہم کی زبان پر آئے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ یہ الہام اپنے فرشتے کی زبان پر کیونکر پہنچاتا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فرشتے کے ذہن میں اپنا منشا منکشف کرتا ہے۔ کیونکہ وہ وہاں موجود ہے۔ تو کیا وہ پیغمبر کے ذہن میں موجود نہیں۔ کہ وہاں تک پیغام پہنچانے کے لئے قاصد کا استعمال کرتا ہے؟ محیط کل نہ بھی ہو۔ جیسے ہم کسی گذشتہ باب میں بتا چکے ہیں۔ کہ قرآن کے بعض بیانات کے مطابق وہ محدود ہے۔ تو بھی جس قدرت کے طفیل عرش پر بیٹھا بیٹھا تمام عالم کا کام چلاتا ہے۔ اسی سے پیغمبر کے دل میں الہام کیوں نہیں ڈالتا؟ فرشتہ اللہ اور پیغمبر کے درمیان ایک بے ضرورت واسطہ ہے۔ یہ نقص ہے الہام کے قرآنی طریق میں۔

قرآن کو پرماتما کا کلام ماننے میں ایک امر یہ بھی مانع ہے۔ کہ پرماتما کا کلام اٹل ہونا چاہیئے۔ اس میں تنسیخ کی گنجائش نہ ہونی چاہیئے لیکن

قرآن میں صاف تحریر ہے۔ کہ اس کے احکام میں تنسیخ ہوتی رہی ہے۔
مثلاً سورہ بقر ع ۱۳ میں مرقوم ہے۔
مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ
(سورہ بقر۔ رکوع ۱۳)
جو نسخ کرتے ہیں ہم آیتوں میں سے یا بھلا دیتے ہیں ہم۔ لاتے ہیں
ہم بہتر اس سے یا مانند اس کے۔
اہل اسلام کا دعویٰ تو یہ ہے۔ کہ قرآن کے متن کی حفاظت کا ذمہ
خود اللہ میاں نے اپنے اوپر لیا ہے۔ لیکن قرآن نہ صرف تنسیخ کا امکان
ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ بھول جانے کا بھی۔ چلو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلو۔
کہ قرآن کا کوئی قول منسوخ نہیں ہوتا۔ اور یہ وُہی قرآن ہے۔ جو ازل
سے لوح محفوظ پر ثبت ہے۔ تب ان تاریخی قصوں کا کیا کیجئے گا۔ جو قرآن
میں درج ہیں۔ مثلاً سورہ یوسف میں یوسف اور زلیخا کا مکالمہ ہے۔
وَرَاوَدَتۡهُ الَّتِیۡ هُوَ فِیۡ بَیۡتِهَا عَنۡ نَّفۡسِهٖ وَغَلَّقَتِ الۡاَبۡوَابَ
وَقَالَتۡ هَیۡتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیۡۤ اَحۡسَنَ مَثۡوَایَ ؕ
اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝ (سورہ یوسف۔ آیت ۲۳)
اور پھسلا دیا اس کو اس عورت نے کہ وہ بیچ اس گھر کے تھا جان
اس کی سے اور بند کئے دروازے۔ اور کہنے لگی آ کہتی ہوں میں
تجھ کو۔ کہا۔ پناہ پکڑتا ہوں میں اللہ کی تحقیق وہ پرورش کرنے والا
ہے میرا اچھی طرح سے۔ کیا اس نے کہنا میرا۔ تحقیق نہیں فلاح پاتے
ظالم۔
اگر یہ کلام ازلی ہو۔ تو ظاہر ہے۔ کہ حضرت یوسف ازل سے

پرہیزگار مقرر کیئے گئے - اور زلیخا ازل سے ظالم ٹھیری - اب اللہ میاں کا لکھا تقدیر کا لکھا ہے - وہ ٹل نہیں سکتا - کوئی پوچھے - ایسا وضع کیئے پیچھے الہام کی ضرورت کیا ہے ؟ گنہگار ازل سے گنہگار بن چکے - وہ ہدایت پا نہیں سکتے - اور پرہیزگار ازل سے پرہیزگار وضع کیئے جا چکے - انہیں ہدایت کی ضرورت نہیں - قرآن کا آنا اکارت -

یہی حالت اس بڑھیا کی ہے - جو حضرت لوط کے عیال میں سے ہلاکت کی نذر ہوئی تھی - فرمایا ہے -

اِذْ نَجَّیْنٰہُ وَاَھْلَہٗٓ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ۝

(سورہ صافات - آیت ۱۳۴ - ۱۳۵)

جب ہم نے نجات دی اس کو اور اس کے تمام اہل کو سوائے ایک بڑھیا کے جو ٹھیرنے والوں میں تھی -

حضرت نوح کا لڑکا اور بیوی - حضرت محمد کے چچا ابولہب وغیرہ ایسے اشخاص کا ذکر قرآن میں ہے - جنہیں اگر قرآن ازلی ہو - تو ازل سے ہی دوزخ کے لیئے چُن لیا گیا ہے - اور انبیا اور اُن کے دیگر عیال کو بہشت میں جگہ مل چکی ہے - قرآن کے الہام کا فائدہ کس کے لیئے ہے ؟

پس ہم نے ثابت کر دیا - کہ نہ تو اہل اسلام کا تسلیم کردہ طریق الہام درست ہے - نہ الہامات کے سلسلہ کا عقیدہ عیب سے خالی ہے - نہ قرآن اس عقیدے کے ماتحت آخری الہام تصور ہونے کا حقدار رہی ہے نہ اس کی زبان ایسی ہے - جو دُنیا بھر کی تمام قوموں کی مشترکہ بولی ہو - وید کی زبان ابتدائے آفرینش میں تو اہل عالم کی ساجھی بولی تھی ہی - اس وقت بھی اس پر اقوام عالم کا مشترکہ حق اس طرح ہے - کہ وہ ہر

قوم کی موجودہ زبان کا ابتدائی ماخذ ہے۔ وہ ان معانی کا ذخیرہ ہے جن
کا اظہار بعد کی بگڑی یا بنی زبانوں کی لغات کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ زمانہ حال
کی مروّجہ زبانوں کی مصادر۔ ویدک زبان کی مصادر ہیں۔ جن کے یوگک یعنی
لغوی معنوں کی وجہ سے وید کے الفاظ مطالب کا بے انتہا معدن بنے
ہوئے ہیں۔ پھر وید میں تاریخی قصّے بھی نہیں۔ جیسے قرآن میں ہیں۔ اگر
قرآن اللہ میاں کا قدیم کلام ہو۔ اور وہ منسوخ نہ ہو سکے۔ تو اس کے
بیان کردہ ازلی گنہگار اور پرہیزگار شروع سے ہی گنہگار اور پرہیزگار
گھڑے گئے ہیں۔ ان کی طبیعت بدل نہیں سکتی۔ الہام کا اعادہ کون کریگا؟
درحقیقت قرآن ازلی کلام نہیں ہے۔ ہم نے خود قرآن کے حوالوں سے
ثابت کیا ہے۔ کہ قرآن اپنے آپ کو قوم عرب کے لئے جو اس وقت الہام
کی نعمت سے بے بہرہ تھی۔ اس وقت کا دستور العمل ظاہر کرتا ہے۔ اور
اس بات کا امکان بھی ظاہر کرتا ہے۔ کہ اسے واپس لے لیا جائے۔
اُم الکتاب یا وید ماتا کی طرف اشارہ کہ وہ بلند حکمت بھرا نسخہ ہے۔ جو ہمیشہ
کے لئے محفوظ ہے۔ نہایت معنی خیز ہے +

سزا و جزا

جملہ مذاہب میں اخلاق کی بنیاد سزا و جزا کا مسئلہ ہے۔ انسانی انصاف گویا الٰہی انصاف کی ایک نقل ہے۔ انسانی انصاف میں انسانی نقائص کی وجہ سے نقص رہ پایا جاتا ہے۔ لیکن الٰہی انصاف میں نقص کا امکان نہیں۔ جیسے پرماتما مکمل ہے۔ ویسے ہی اس کا انصاف بھی مکمل ہے۔

پرماتما میں انصاف کے ساتھ ساتھ رحم کی صفت بھی پائی جاتی ہے۔ ان دو صفات کا تطابق کیسے ہو؟ رشی دیانند نے پرماتما کے انصاف کو رحم کا مترادف کہا ہے۔ پرماتما کے ارادے میں رحم ہے اور فعل میں انصاف۔ پرماتما سزا اور جزا دیتا ہی فاعل روح کی اصلاح کے لئے ہے۔ نیکی کی جزا رُوحانی بھی ہے۔ اور جسمانی بھی۔ رُوحانی جزا تو روح کا ارتقا ہے۔ نیک عمل کرنے والے کی روحانی حالت کو پہلے سے بہتر بنا جاتا ہے۔ اور جسمانی جزا وہ راحت ہے۔ جو حواس کے ذریعے جن میں من یعنی ذہنی حس بھی شامل ہے۔ محسوس کی جاتی ہے۔ یہی حالت سزا کی ہے۔ رُوحانی سزا رُوح کا تنزل ہے۔ اور جسمانی سزا وہ رنج جو حواس کے ذریعے محسوس کیا جاتا ہے۔

آریہ اعتقاد کے مطابق موجودہ حیات کے راحت اور رنج اس یا کسی گذشتہ حیات کے نیک اور بد اعمال کا ثمر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو۔ تو موجودہ زندگی کے رنج کے لئے کوئی معقول باعث نہیں رہ جاتا۔ بغیر وجہ کے

کسی کی قسمت میں رنج رکھ دینے سے پرماتما پر (معاذ اللہ) ظالم ہونے کا نقص عائد ہوتا ہے۔ اور بے وجہ انسانوں کی راحت میں تفاوت کر دینے سے بے انصافی کا حرف آتا ہے۔

اہل اسلام تناسخ کے قائل نہیں۔ سو وہ موجودہ زندگی کے ایسے محسوسات کی جن کے لئے موجودہ زندگی کے اعمال ذمہ دار نہیں۔ کوئی معقول وجہ بیان نہیں کر سکتے۔ مثلاً نہایت پرہیزگار لوگ بھی آرام پاتے ہیں۔ حضرت محمد اہل اسلام کی نظر میں بے گناہ شخصیت ہیں۔ مگر آپ کے فرزند حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا۔ جس سے حضرت کو رنج تھا۔ حضرت نے آنسو بھی گرائے۔ حضرت خود وفات سے پہلے بیمار رہے۔ اس کی وجہ؟

اگر موجودہ زندگی کے مصائب اور انعام بے وجہ ملے ہیں۔ تو آئندہ یعنی عقبیٰ کے دوزخ اور بہشت پر عمل کی پابندی کا مسلمہ فلسفیانہ نظر سے کہاں تک معقول ہے؟ یا پھر یہ ماننا ہوگا۔ کہ دنیا میں تو خدا بغیر انصاف کے کام چلاتا ہے۔ مگر عقبیٰ میں اپنا طرز عمل بدل لیگا۔ سزا و جزا کا مسلمہ ماننے کے نتیجے جہاں پرماتما کو منصف ماننا لازم ہے۔ وہاں اس کے انصاف کی صفت میں ازلیت اور ابدیت کا وصف تسلیم کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ فاعل ارواح کو بھی ازلی اور ابدی مانا جائے۔ اور چونکہ ایک زندگی کے اعمال کا ایک ہی زندگی میں ثمر نہیں مل جاتا۔ اس لئے کثیر زندگیاں تسلیم کی جائیں گی۔ اہل اسلام اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی کے تو قائل ہیں۔ جسے وہ عقبیٰ کا نام دیتے ہیں۔ وہ اس زندگی کے اعمال کی سزا و جزا کا بڑا حصہ اسی عقبیٰ کے لئے محفوظ

رکھتے ہیں۔ لیکن اس زندگی سے پہلے کسی اور زندگی کے قائل نہیں معقولیت یہ چاہتی ہے۔ کہ سابقہ حیات کے بھی قائل ہوں۔ اور اس کا نام ازلی یا قدیم رکھ دیں۔ تناسخ کا مسلہ سزا و جزا کے مسئلہ کا لازمی ہے۔ دُنیا کے بعد عقبیٰ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جب ایک کڑی مانی۔ تو سارا سلسلہ ماننا ہی ہوگا۔ ورنہ اللہ میاں کا انصاف غیر ... اور غیر مکمل رہیگا اور جب عدم سے وجود کیا ہے۔ اور ہر فاعل پر تقدیر ... لگا دی ہے۔ تب تو کوئی فاعل فاعل رہا ہی نہیں۔ اہل اسلام ... میں فاعل حقیقی اللہ میاں ہے۔ تب مجرم حقیقی یا سزایاب حقیقی دوسرے ... ہیں؟

آیئے۔ اس مجازی انصاف پر ہی ایک نظر ... لیں۔ کیا وہ انصاف اس ایک کڑی کی حدود میں بھی جو دُنیا کو عقبیٰ سے ملاتی ہے۔ مکمل ہے سہی؟ تقدیر کے مسلہ کے بعد انصاف کا مسلہ ہے تو مذاق ہی لیکن چلو۔ اس مذاق میں بھی کچھ معقولیت ہو تو اچھا ہے۔ سورہ نحل آیت ۱۰۶ میں مرقوم ہے۔

وَتُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ○ (نحل - ۱۰۶)

اور پورا دیا جائیگا ہر روح کو جو اس نے کیا ہے۔ اور وہ نہ ظلم کیے جائیں گے۔

اور اگر کیا ہی تقدیر کے جبر کے ماتحت ہو تب؟ تقدیر کی مجبوری نہ ہو۔ تو اصول اچھا ہے۔

سورہ نبا میں فرمایا ہے۔

جَزَآءً وِّفَاقًا ○ (سورہ نبا - ۲۵)

بدلا دیئے جائیں گے موافق اعمال کے۔

سورہ نسا میں کہا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ ۔ (نسا - آیت ۳۸)

تحقیق اللہ ظلم نہیں کرتا برابر ایک ذرہ کے

لیکن اسی آیت میں معاً اِس قول کے آگے کہا ہے ۔

وَاِنْ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفْھَا

اور جو نیکی ہو ۔ اُسے دگنا کر دیتا ہے ۔

نیک عمل تو جتنا کیا گیا ہے ۔ اُتنا ہی رہیگا ۔ ہاں اُس کی جزا بڑھائی گھٹائی جا سکتی ہے ۔ یہی قرآن شریف کے اس قول کا مفہوم معلوم ہوتا ہے ۔

سورہ بقر میں کہا ہے ۔

وَقُوْلُوْا حِطَّۃٌ نَّغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

(سورہ بقر - آیت ۵۹)

اور کہو کہ معافی مانگتے ہیں ۔ ہم معاف کریں گے تمہاری خطائیں ۔ اور زیادہ دیں گے نیکی کرنے والے کو ۔

قرآن میں نیکی کا اجر دوگنا ملنے کا ذکر بار بار ہؤا ہے ۔ زیادہ دینے کے معنے بھی یہی ہونگے ۔ ہماری سمجھ میں اس دُگنا کر دینے کے معنے نہیں آئے اگر جزا کا پیمانہ مختلف فاعلوں کی صورت میں مختلف ہوتا ۔ تو سمجھ میں آجاتا ۔ کہ الف اور ب برابر نیکی کریں ۔ تو الف کی نسبت ب کو دوگنی جزا ملیگی ۔ لیکن اگر دونو کو برابر جزا ملنی ہو ۔ تو وہ دُگنی کس سے ہوگی ؟ اپنے نصف سے ؟ نیکی اور اس کی جزا کا باہمی حسابی تناسب ایک وزن سے تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ اجناس ہی مختلف ہیں ۔ نیکی کی ایک مقررہ مقدار کے بدلے میں جزا کی ایک مقررہ مقدار دی جائیگی ۔ ان دو مقداروں کو غیر برابر کی نسبت برابر کنا زیادہ موزوں ہے ۔ نیکی کا سکہ جدا ہے ۔ جزا کا سکہ جدا ۔ کا دو بار میں

مقررہ مقداروں کو جو ایک دوسرے کا بدل ہو جائیں برابر کہا جاتا
ہے۔ اور اس کے بعد ان دونوں کے دوچند بھی برابر ہو جائیں گے۔ کتنی
نیکی کی کتنی جزا ملیگی؟ یہ پرماتما نے قانون بنا دیا۔ اب ان دو مقداروں
کو چاہے برابر کہہ لو۔ اور چاہے ایک کو دوسرے کا دوچند مان لو۔ فرق
لفظی ہے۔ حقیقی نہیں۔ مثلاً کھانڈ کا بھاؤ دو سیری روپیہ کر دیا جائے۔
اب ایک روپے اور دو سیر کھانڈ میں حقیقی تناسب کچھ نہیں۔ مگر ہم بیوپاری
لوگ انہیں برابر کہہ دیں گے۔ کوئی دوکاندار کسی دوست کو ایک روپے
کی چار سیر کھانڈ دے تو وہ کہہ سکتا ہے۔ کہ میں نے اسے روپے
کا دوگنا مال دیا۔ لیکن وہ نرخ کی حدود میں رہ کر کھانڈ کو روپے کا دوگنا
نہیں کہہ سکتا۔ تول کے لحاظ سے ان دو جنسوں میں کوئی تناسب ضرور
ہے۔ لیکن نیکی اور جزا دونو تول کے وصف سے خالی ہیں۔ بمندرجہ بالا اقوال
میں کسی خاص محبوب کے ساتھ رعایت کا ذکر نہیں۔ نیکی اور جزا کا نرخ
بتایا ہے۔ وہ نرخ ہر ایک کے لئے برابر ہے۔ اس میں جزا کو نیکی کا
دوگنا کہنا فقط لفظی رعایت ہے۔ حقیقی رعایت نہیں۔ چلو مسلمان بھائیوں کی
رعایت سے یوں مان لو۔ کہ کسی نے یہاں ہزار روپیہ سخاوت میں دیا۔ تو
اسے عقبیٰ میں دو ہزار مل جائیں گے۔ مگر عقبیٰ کا عرصہ تو بے انتہا ہے۔ اس
میں دو ہزار سے کیا بنے گا؟ محدود نیکی کا پھل بے انتہا عرصہ میں دوچند بھی
دو۔ تو بے مقدار ہے۔ اس طرح سخاوت کا دوچند تو کچھ ہو گیا۔ اگر کسی
نے یہاں نماز پڑھی۔ اس کا دوچند پھل کیا ہوگا۔ کوئی اسے دوچند سجدہ
کرے گا؟ یہ بات تو ہو نہیں سکتی۔ آخر یہ دوچند کیا ہے؟
ہاں معانی کی بات اور ہے۔ وہ جتنے چند ہو۔ بن جائیگی۔ یا تعداید

تناسب کی حد سے وہ بھی باہر ہو۔ کہا ہے۔

عَفَا اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ وَمَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰہُ مِنْہُ (مائدہ ۹۴)

معاف کیا اللہ نے جو ہو چکا اور جو کوئی پھر کر گیا۔ اللہ اس سے انتقام لے گا۔

ایک خاص وقت سے پہلے کئے گئے گناہ سب معاف کر دیئے۔ یہ کیوں؟ اور وہ بھی خاص اشخاص کے۔ اس میں انصاف کہاں رہا؟ حضرت محمد صاحب یا دیگر پیغمبروں کے زمانے میں ان حضرات کی صحبت کا شرف تو بلا ہی محدود سے چند اشخاص کو۔ ان میں سے بھی فقط بعض کو معافی کے لئے منتخب کر لینا۔ اور دوسروں کو نہ صحبت کا شرف بخشنا۔ نہ اس کے اخلاقی نتیجہ اصلاح اعمال کا موقعہ دینا۔ اور نہ پھر بخشنا انصاف خداوندانہ سے بعید ہے۔

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اھْتَدٰی

(سورہ طٰہٰ۔ آیت ۷۶)

اور تحقیق میں البتہ بخشتا ہوں واسطے اس کے جس نے توبہ کی اور ایمان لایا۔ عمل کئے اچھے۔ پھر ہدایت پائی۔

تفسیر حسینی میں اس عبارت کا مفہوم یوں بیان کیا ہے۔

توبہ کرد از شرک۔ ایمان آورد بوحدانیت۔ بہ سنت پیغمبر صلعم مواظبت کرد۔ یا طریق اہل سنت و جماعت گرفت۔ و فریضہا ادا کرد۔

توبہ کی شرک سے۔ ایمان لایا وحدانیت پر۔ پیغمبر کی سنت کے پابند ہوئے۔ یا اہل سنت و جماعت کا طریق اختیار کیا۔ اور فرض ادا کئے۔

آخری جملہ کے معنی جلالین میں آئے ہیں:-

زکوۃ ادا کرے۔ اور صدقہ نفل ادا کرے۔

دوسرے معنوں میں تسلّی ہو جانے سے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ یہ انصاف اچھا ہے!

سورہ شعرا میں کہا ہے۔

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۝ (شعرا۔ ع ۵)

اور اُمید رکھتا ہوں میں کہ بخشیگا میری خطائیں دن قیامت کے۔

یہ اُمید کوئی شجاعت کی اُمید نہیں۔ بالخصوص جب یہاں اپنے عقیدہ کے مطابق بغیر اعمال تکلیف سہتے ہو۔ عقبیٰ میں گناہوں کے ہوتے معافی کا خواستگار ہونا کچھ عجب قسم کی خوش اعتقادی ہے۔

کسی گذشتہ باب میں قرآن شریف کے پیغمبروں کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے حضرت موسیٰ کے مُکّے سے ایک شخص کے قتل ہونے کی واردات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ فرمایا ہے۔

فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَیْهِ ۔۔ ۔۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝

(سورہ قصص ۔ ۱۴۔۱۵۔ ۲۶)

پس مُکّا مارا موسیٰ نے۔ پس تمام کی زندگی اس کی ۔۔ ۔۔ (کہا) یا رب میں نے ظلم کیا اپنے جی پر۔ پس بخش مجھ کو۔ پس بخش دیا اس کو تحقیق وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ قول کسی حاشیہ کا محتاج نہیں۔ اگر قتل بھی معاف ہونے لگے۔ تو انصاف ہو چکا۔ کہا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (زمر ع ۵)

تحقیق اللہ بخشتا ہے سب گناہ - وہی ہے بخشنے والا رحیم -

یعنی چھٹی ہوئی - گناہ کی سزا ہی نہ رہی - اس اذن عام کے خلاف تو مفسر لوگوں نے بھی احتجاج کیا ہے - تفسیر حسینی میں لکھا ہے -

بغیر شرک کہ مطلق آمرزیدہ نہ شود -

سوائے شرک کے کہ ہرگز معاف نہیں کیا جاتا -

یہ بات کہ کونسا جرم قابل معافی نہیں - راقم کے اخلاقی تصور پر منحصر ہے - تعزیرات ہند میں شرک کی سزا نہیں قتل کی ہے - سورہ مومن میں آیا ہے -

اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ - (مومن-۲)

اللہ غالب ہے جاننے والا - بخشنے والا گناہ کا - قبول کرنے والا توبہ کا -

تفسیر حسینی اِس حکم کا افادہ بھی ہر کس و ناکس کے لئے عام نہیں کرتی - کہا ہے -

ہر کسیکہ اگر بصدق گوید - لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

اُس شخص کو جو سچے دل سے لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کہے -

سورہ محمد میں فرمایا ہے -

وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ - (سورہ محمد - آیہ ۱۶)

اور معافی ہے پروردگار ان کے کی -

اب پورا صلہ دینے اور اعمال کے مطابق جزا عطا کرنے کی بات کہاں گئی؟ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں نہایت پرہیزگار لوگ بھی آلام سے بچ نہیں رہے - مثلاً حضرت محمد کو جو اہل اسلام کے نزدیک تمام بنی نوع انسان میں اخلاقاً برگزیدہ ہیں - اور گناہ کا شائبہ بھی ان پر

نہیں آیا - خود اپنے عزیز فرزند کی وفات کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا -
اگر اس دُنیا میں ہی نیک سے نیک لوگ مصائب سے - جو ہماری نظر
میں گذشتہ اعمال کا ثمر ہیں - اور اہل اسلام کے عقیدے کے مطابق
بے وجہ برداشت کرنی پڑ رہی ہیں - بری نہیں - تو عقبےٰ میں جہاں اچھے
بُرے اعمال موجود ہونگے - ان کے ثمر سے بریت کیونکر ہوگی ؟ سمجھ میں
نہیں آتا - کہ اہل اسلام بغیر اعمال کے مصیبت نازل کئے جانے
کو تو مشیت الہیٰ تسلیم فرماتے ہیں - اور اعمال کے ہوتے اس کی سزا کو
مشیت قرار نہیں دیتے - اللہ میاں کا عفو (؟) دُنیا میں ظلم کی صورت اختیار
کیوں کرتا ہے ؟ بھائی ! ہماری مانو - اور نہ بے جا عفو کے قائل رہو
اور نہ بے جا ظلم کے - انصاف ان دونوں کی نفی ہے -
لیجئے - معاف کرنے ہی پر بس نہیں - اس سے بھی تجاوز فرمایا ہے -
رحمت الٰہی اپنے پورے زوروں پر ہے -

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ط (سورہ فرقان - ۷۰)

اور بدل ڈالتا ہے - اللہ بُرائیاں ان کی بھلائیوں سے -

تفسیر جلالین میں اس قول کی وضاحت یوں فرمائی ہے -

ایسے شخص کی بُرائیوں کو آخرت میں نیکیوں سے بدلے گا -

بُرائیاں تو کیں دُنیا میں - اور انہیں بدل دیا آخرت میں بھلائیوں سے
یہ سلوک کسی سے کیا جائے - بے قانونی صاف ہے - اب تک اتنی
ہی خیر تھی - کہ بُرائیاں معاف ہو رہی تھیں - اور بھلائی کے صلہ میں اضافہ
ہو رہا تھا - کسی کسی کی بُرائی بھلائی بنا دی جاتی تھی - اس طرز عمل پر کوئی
بے تعلق شخص اعتراض کرے تو کرے - کوئی اصول کا شیدائی فلاسفر

مانگلی رکھے تو رکھے۔ جس شخص سے یہ رحمت کا برتاؤ ہوتا ہے۔ اسے اس عمل پر اعتراض نہیں۔ کیونکہ اس کی تو پانچوں گھی میں ہیں۔ اور وہ اس بے تعلق اصول پرست فلاسفر سے بھی کہہ سکتا ہے۔ کہ بھائی! فلسفہ کسی کی خوش قسمتی پر روتا ہے۔ رویا کرے۔ تو کیوں مفت میں حسد کرتا ہے؟ مجھ پر مفت مہربانی ہونے سے تیرا کچھ بگڑتا نہیں۔ تیرے یہ آنسو ہمدردی کے آنسو تب ہوں۔ جب نیکی کو معاف (ل) کر دیا جائے؟ یعنی اس کی جزا نہ ہو۔ یا برائی کی سزا میں اضافہ ہو۔ دیکھیں قرآن شریف اس بارے میں کیا حکم نازل کرتا ہے؟

سورہ مائدہ میں فرمایا ہے۔

يَغْفِرُ لِمَن يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَآءُ (سورہ مائدہ۔ آیت ۱۷)

بخشتا ہے۔ جسے چاہتا ہے اور عذاب دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔

سورہ احزاب میں کہا ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَن يَّأْتِ مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ط (سورہ احزاب۔ آیت ۳۰)

اے بی بیو نبی کی! جو کوئی آوے تم میں سے ساتھ بے حیائی ظاہر کے۔ دو چند کیا جائیگا واسطے اس کے عذاب۔

پیغمبر صاحب کی بیویوں سے یہ خاص سلوک کیوں؟ تفسیر حسینی میں کہا ہے:۔

از شما کہ ازواج پیغمبرید فرمانبردید مر خدائے و رسول را و بکنید اعمال شائستہ بدہیم مر او را اجر او را دو بارہ۔ یک بار برائے طاعت خدا تعالیٰ و یکبار برائے طلب خوشنودی پیغمبر صلعم۔

تم سے جو پیغمبر کی بیویاں ہو۔ فرمانبرداری کرتی ہو خدا اور پیغمبر کی۔ اور نیک اعمال کرتی ہو۔ اس کا اجر دوبارہ دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ خدا کی طاعت کی وجہ سے اور ایک پیغمبر کی خوشنودی کی وجہ سے

شاید برائی کا صلہ بھی اسی وجہ سے دوگنا مقرر ہو۔ آخر عمل تو ایک ہی کیا گیا۔ حضرت پیغمبر اس سے اسی لئے تو خوش ہونگے۔ کہ اللہ کی طاعت کی ہے۔ اُن کی خوشی کا اپنا الگ صلہ کیوں؟ اس خوشی میں حضرت ازواج کے اعمال کا جدا دخل کیا؟ اسلامی فلسفہ مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے۔ کوئی صاحب کہیں۔ حضرت محمد اور اُن کے عیال کا معاملہ خاص ہے بحث عوام کی سزا جزا پر ہونی چاہیئے۔ لیجئے۔ سورہ فرقان میں فرمایا ہے۔

يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا

(سورہ فرقان۔ رکوع ۶)

دُگنا کیا جائے گا ان کے لئے عذاب قیامت کے روز اور وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں مصیبت اٹھاتے۔

کیا اس حکم کے ہوتے بھی کوئی کہہ سکتا ہے۔ اللہ میاں "ذرہ بھر" بھی ظلم نہیں کریگا؟ اس حکم میں کسی خاص گروہ کی تخصیص نہیں۔ ایک اور مقام پر بقول مولانا ثناء اللہ حریفان اسلام کے سرگروہوں کو دُگنا عذاب دئیے جانے کی خواہش کو ان کے جہنمی پیروؤں کی استدعا کی شکل بخشی گئی ہے۔ کفار کا کوئی ڈیپوٹیشن تو نہ اللہ میاں کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نہ حضرت پیغمبر کی خدمت میں۔ کہ ہمارے ہادیوں کو سخت سے سخت سزا دیجئے۔ ایک خیالی قیامت کا نقشہ وضع کر کے اس میں کفار کی طرف سے

یہ درخواست دلانے کے سوائے اس کے اور کیا معنی ہیں۔ کہ مصنف قرآن کی اپنی مرضی یہ ہے؟ چنانچہ کہا ہے۔

رَبَّنَا اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝

(سورہ احزاب - آیت ۶۷-۶۸)

اے ہمارے رب! دے ان کو دگنا عذاب اور لعنت کر اُن کو سخت۔

علم الاذہان کے سمجھنے والے جانتے ہیں۔ کہ کسی خیالی مقام پر کسی خیالی حالت میں کسی اور کے منہ میں ڈالی ہوئی دعا۔ بالخصوص جب اس کی غیر مقبولیت کا ذکر بھی نہ کیا جائے۔ درحقیقت اپنی دعا ہوتی ہے۔ اس آیت کی یہ تعبیر ہم نے مولانا ثناءاللہ صاحب کی رعایت سے تسلیم کی ہے ورنہ یہ آیت اس سے پہلی آیت سے جدا ہے۔ اور اس کے مفہوم کا تعلق براہ راست مصنف قرآن کی خواہش سے قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہوا اللہ میاں کا گناہ کی اور اس کی سزا کی مقدار میں انصاف۔ اب ایک گناہ کے محض امکان کی سزا کی مثال سُنئے۔

سورہ کہف میں حضرت خضر اور حضرت موسیٰ کے ایک سفر کا ذکر ہے۔ اس سفر کے دوران میں حضرت خضر نے ایک لڑکے کو مار ڈالا حضرت موسیٰ نے پوچھا۔

اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ۔ (سورہ کہف - آیت ۷۴)

کیا تو نے مار ڈالا ایک جان پاک کو بغیر بدلے جان کے۔

اس وقت تو حضرت خضر نے انہیں ڈانٹ دیا۔ کہ خلاف وعدہ سوال کیوں پوچھتے ہو؟ مگر بعد میں جب سفر ختم ہوا۔ تو فرمایا

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا

وَّكُفْرًا ۝ (سورہ کہف - آیت ۸۰)

اور وہ جو لڑکا تھا - اس کے والدین مومن تھے - پس ڈرے ہم کبھی وہ غالب آئے ان پر سرکشی اور کفر میں -

ڈر یہ تھا - کہ کہیں انہیں سرکش اور کافر نہ کر دے - اس ڈر سے لڑکے کو قتل کر دیا - یہ قتل کرنے والے حضرت خضر بھی اللہ میاں کے پیغمبر ہیں اور ان کے اس کارنامے کا اندراج موعظۃ قرآن شریف کے اوراق میں ہوا ہے - آپ کے اس مبارک فعل پر اللہ میاں اور حضرت محمد کی مہر ہے - یہ ہے انصاف رحمانی! کوئی پوچھے - اس ممکن سرکشی کا مادہ اس کی طبیعت میں ڈالا کس نے؟ خود اس چیز کو ممکن کرتے ہو - پھر اس امکان کی سزا دیتے ہو - اور اتنی بھی انتظار نہیں کرتے - کہ وہ امکان عمل کی صورت تو اختیار کر لے -

اس لڑکے کے متعلق پھر خدشہ تو تھا - مگر یہاں تو بستیاں کی بستیاں مورد عذاب ہوئی ہیں - چنانچہ لکھا ہے -

وَتِلْكَ الْقُرٰىٓ اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا

(سورہ کہف - آیت ۵۹)

اور یہ بستیاں ہیں - کہ ہلاک کیا ہم نے ان کو جب ظلم کیا انہوں نے - اور ہم نے ان کی ہلاکت کا وعدہ مقرر کیا تھا -

جب وعدہ ہی مقرر تھا - تو ان کے ظلم کو ان کی ہلاکت کے لئے عذر کیوں پیش کرتے ہو؟ اللہ میاں کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہنا تھا - چاہے وہ ظلم کرتیں یا نہ کرتیں - اور اگر ان کا ظلم بھی پہلے سے مقدر تھا - تو پھر اس ظلم میں بھی ان کا کیا قصور؟ ظلم کرانے والے کا ہے - پھر ایسا کونسا گناہ ہے

جس میں کسی بستی کے سب لوگ۔ زن و مرد۔ پیر و جوان۔ یکساں شریک ہوں؟ نیک و بد ہر قسم کے لوگ ہر شہر و دہ میں بستے ہیں۔ سب کو ایک رسّی سے باندھ لینا۔ اور یکدم ہلاکت کے کوئیں میں دھکیل دینا "اندھیر نگری۔ بیداد راجا" والی بات ہے۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے۔ کہ کسی پرانی زندگی یا زندگیوں کے گنہگار ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں۔ اور اُن کے کسی پرانے بڑے گناہ کی سزا یکلخت دے دی جائے۔ لیکن ایک ہی زندگی میں سب کا برابر گنہگار ہونا مشاہدے میں نہیں آیا۔ اس آبادی میں کچھ نوزاد بچّے بھی ہونگے۔ اُنہوں نے کیا ظلم کر لیا تھا؟ لیجئے ایک جگہ ظلم کی کیفیت کا بھی ذکر فرما دیا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝ (سورہ محمد۔ آیت ۱۳)

اور کتنی بستیاں تھیں جو سخت تھیں قوت میں بستی تیری سے۔ جس نے نکال دیا تجھ کو۔ ہلاک کیا ہم نے اُن کو پس نہ ہوا کوئی مدد کرنے والا واسطے اُن کے

حضرت محمد صاحب کے اخراج کے ظلم میں ساری بستی شریک ہو۔ یہ ممکن ہی کیونکر ہو سکتا ہے؟ مگر ہلاک بستیاں کی جائیں گی۔ کیوں؟ ان کے ہلاک ہونے کا وعدہ ہے۔

خلق من العدم اور تقدیر کے مسلمات کے بعد انصاف کا دعویٰ درحقیقت انصاف کا مذاق ہے۔ تاہم ہم نے اس مذاق کا بھی تبصرہ اس لئے کیا ہے۔ کہ ممکن ہے اس مذاق میں سے ہی کوئی سنجیدہ بات نکل آئے۔ لکھنے کو تو لکھ دیا ہے۔ کہ اعمال کے مطابق ثمر ملتا ہے۔ اور ذرہ بھر ظلم نہیں ہوتا۔ لیکن پھر فرمایا ہے۔ کہ نیکی کا پھل دُگنا دیا جاتا ہے۔ اِس

دو چند کی فلسفیانہ حقیقت کیا ہے؟ لفظوں ہی کا پھیر ہے۔ معنی اس دو چند کے، اور عمل اور اس کی جزا کی مساوات کے ایک ہیں۔ اور اگر یہ دو چند اجر بے انتہا زمانے میں ملتا ہو۔ تو اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں رہتی۔ پھر معافی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اسلامی عقیدے کے مطابق دُنیوی آرام اور مصیبتیں بغیر اعمال کے بخشی گئی ہیں۔ اب اگر بغیر گناہ کے تکلیف دینے میں تامل نہیں۔ تو گناہ کے ہوتے تکلیف کیونکر نہ دی جائیگی؟ یہ ذرا مشکل سے قیاس میں آنے والی بات ہے۔ پھر معافی بھی سب گناہوں کی موعود ہے یہ گناہ کی تحریص نہیں تو کیا ہے؟ انصاف کا خاتمہ اسی پہ ہوتا۔ تو شکایت نہ تھی۔ یہاں تو گناہ کی سزا بھی دُگنی کر رکھی ہے۔ اور پھر کہا ہے۔ ظلم نہیں ہوتا۔ یہی نہیں۔ کُفر کے امکان کا بدلہ دیا ہے قتل۔ اور وہ ایک پیغمبر کے ہاتھوں۔ بے انصافی کی حد نہیں رہتی۔ جب ایک مقرر وعدہ کی وجہ سے جو تقدیر کا دوسرا نام ہے۔ بستیوں کی بستیاں یکایک غارت کی جاتی ہیں۔ جُرم چاہے بستی کے ایک حصّے کا ہو۔ مگر سزا نوزاد بچوں کو بھی بھگتنی ہوگی۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

پوچھا گناہ کیا تھا؟ کہا۔ بل بے سادگی!
کیا یہ گُنہ نہیں۔ نہ ہوئے تم گنہگار؟

"قیامت کی رات"

گذشتہ باب میں اللہ تعالیٰ کے انصاف کے مقیاس کو تو ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ کیا صحیح محاسبہ کیا جاتا ہے! اب ہم اس انصاف کا دستورالعمل دیکھیں گے۔ اس کے لئے روز قیامت پر ایک نظر تعمّق ڈال جانا ضروری ہے۔ کیونکہ روز انصاف وہی ہے۔ اہل اسلام کا عقیدہ ہے۔ کہ کائنات کی ابتدا ہے۔ کائنات ایک دن شروع ہوئی تھی۔ پہلے سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور محض عدم تھا۔ ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا۔ کہ عدم کی جگہ وجود نے لے لی۔ کسی کے دل میں خیال گزر سکتا ہے۔ کہ اس سے پہلے اللہ میاں کیا کرتے تھے؟ ان کی صفات کیا کرتی تھیں؟ جو کام پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ وہ یکلخت سُوجھا کیسے؟ کیا یہ اللہ میاں کی زندگی میں انقلاب خیز تبدیلی نہ تھی۔ کہ پہلے تو لاشریک موجود تھے۔ اور اب کم سے کم وجود میں کسی اور کو بھی شریک فرما لیا؟ وحدت سے اُکتا گئے تھے کیا؟ پیری شغل چاہتی تھی؟ کچھ ہو۔ دُنیا موجود ہو گئی۔ اس میں غیر مساوات بھی رکھ دئیے۔ کیونکہ ان کے بغیر عالم کا کارخانہ نہ چلتا تھا۔ غیر مساوات میں کیا اصول کام کرتا تھا؟ ظاہرا اللہ میاں کی مرضی کے سوا اور اصول برتا ہی نہیں گیا۔ یہ بھی ہوا۔ حضرت نے ارواح پیدا کئے۔ ان کو عمل کرنے کی طاقت ہی عنایت نہ فرمائی۔ عمل مقرر بھی کر دئے۔ کسی کی تقدیر میں پرہیزگاری رکھی۔ کسی کی قسمت میں گنہگاری۔ مؤخر الذکر قسمت کا

وسیلہ شیطان کو مقرر کیا۔ دوزخ بھر دینے کا فیصلہ بارگاہ ایزدی سے ازل ہی میں نافذ ہو گیا تھا۔ اس میں جانے والے۔ جلنے والے سب مقرر ہیں۔ مگر اب ایک دن آنا ہے۔ جب اللہ میاں انصاف کی کرسی کو زینت بخشیں گے۔ اور اعمال کا صلہ دیا جائیگا۔ ہم حیران ہو ہو لئے۔ کہ اعمال کس کے؟ اور صلہ کیوں؟ مگر اللہ کی مرضی ہے۔ کہ کرے کرائے تو آپ ہی۔ مگر صلہ ہمیں دے۔ دے دے۔ اس کے لئے دربار لگانا کیا ضروری ہے؟ قسمت تو ہماری شروع ہی سے مقرر ہے۔ پھر اس دن نیا کیا ہوگا؟ اگر اس دربار لگانے ہی کا نام انصاف ہو۔ تو مودبانہ سوال یہ ہے کہ یہ انصاف کا سوانگ ایک ہی دن کیوں کیا جاتا ہے؟ کہیں اس سے اللہ میاں کی صفت انصاف میں عارضی ہونے کا نقص تو عائد نہ ہوگا؟ قیامت کے دن انصاف ہونے سے پہلے اس صفت کا کوئی استعمال نہیں۔ اور اس کے بعد بھی کوئی استعمال کی صورت نہ ہوگی۔

خیر آئیے۔ اس دربار کی زیارت کریں۔ اس دربار کی تمہیدی کوائف بیان فرمائی ہیں۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ط

(سورہ نمل۔ آیت ۸۸)

اور دیکھیگا تُو پہاڑوں کو گمان کریگا تُو ان کو جمے ہوئے۔ اور وہ چلیں گے مانند بادلوں کے۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝

(سورہ واقعہ۔ آیت ۴ - ۵)

جب ہلائی جائیگی زمین خوب اور ٹکڑے ہوں پہاڑ ٹوٹ کر۔

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ٥ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ٥ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ .. .. وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ٥

(سورہ تکویر۔ آیت ۱۔۲۔۳۔ ۱۱)

جب سورج لپیٹا جائیگا۔ اور تارے گدلے ہو جائیں گے۔ اور جب پہاڑ چلیں گے۔ اور جب آسمان کی کھال اُتاری جائیگی۔

سورج لپیٹ دیا گیا۔ تو روشنی ہو نہ سکیگی۔ رات ہو جائیگی اِسی خیال سے سوامی دیانند قیامت کا دن نہیں۔ رات لکھتے ہیں۔ آخری آیت پر جلالین نے لکھا ہے۔

جیسے بکری کا چمڑا اُتارا جاتا ہے۔

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ٥ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ٥ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ٥ (سورہ انفطار۔ آیت ۱تا۴)

جب آسمان پھٹ جائے۔ جب تارے بکھر جائیں۔ جب دریا چیرے جائیں جب قبریں اُٹھائی جائیں۔

قبروں کے معنے یہاں مفسروں نے قبروں میں لیٹے مُردے کیا ہے۔ وہ مُردے بمعہ جسم کے اُٹھیں گے۔ یا اس کے بغیر؟ اُٹھنا بغیر جسم کے کیا ہوگا؟ اہل اسلام کا عقیدہ یہی ہے۔کہ جسم کے ساتھ اُٹھیں گے۔ وہ جسم کہاں سے آئیگا؟ جسم کا انحلال ہو چکا۔ اور وہ قبر میں مل جُل گیا۔ اب جسم کا اُٹھنا یا قبر کا اُٹھنا ایک ہی بات ہے۔ اور جو قبریں اس سے پہلے زائل ہو چکیں گی وہ؟ کچھ ہوگا۔ یہ ہوئی قبروں کی بات۔ اب تارے؟ اُوپر تو تاروں کو گدلا ہی کیا تھا۔ یہاں جھاڑ دیا ہے۔ اور دریا چیرنے سے نہ جائیں۔ کیا مطلب ہے؟

وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (سورہ قیامت آیت ۸)

اور اکٹھا کیا جائیگا سورج اور چاند۔

اس پر تفسیر حسینی میں لکھا ہے۔

یعنی ایشاں را بایکدیگر مجتمع ساختہ در دریا افگنند۔

یعنی ان دونوں کو اکٹھا کرکے دریا میں ڈال دیں گے۔

کیا اس چیرے ہوئے دریا میں؟ لیجئے اب تو روشنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔ سورج کا ہی لپیٹا جانا (اس کے معنی کچھ ہوں) روشنی کے زائل ہو جانے کو کافی ہے۔ کیونکہ چاند بھی تو سورج ہی سے روشنی پاتا ہے۔ لیکن یہاں سورج۔ چاند۔ تارے۔ سب کوئی جھڑ گیا ہے۔ کوئی لپیٹا گیا ہے۔ کوئی دریا میں ڈال دیا ہے۔ اسی قیامت کے دن کو رات ہی نہیں۔ گھُپ اندھیری رات کہنا چاہیئے۔

یہ سب نشانیاں گنتے ہوئے ہم ایک بات بھول گئے۔ وہ ہے نرسنگے کا پھونکا جانا۔ وہ پہلی بار تو ان ساری علامات کے ظاہر ہونے سے پہلے بجیگا۔ اور ایک بار قبروں کے اُٹھنے پر۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ

(سورہ یٰس۔ آیت ۵۰)

اور پھونکا جائیگا نرسنگا۔ پس ناگہاں وہ قبروں میں سے طرف پروردگار اپنے کے دوڑیں گے۔

اس آیت سے یہ تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ساری قبریں دوڑیں گی۔ اس کا ایک حصہ جسم بن کر دوڑے گا۔ مگر ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں۔ کہ ایک قبر کیا؟ قبرستان کے قبرستان زائل ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی جگہ

شہر آباد ہو رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ پہلے پہل قبروں کے کھدنے سے بیماری کا احتمال ہوتا ہے۔ حکما کی رائے ہے۔ کہ مُردے گاڑنے کی رسم اصول صحت کے خلاف ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھ کر یورپ اور امریکہ میں مُردے جلانے کا رواج عام ہو رہا ہے۔

مُردوں کے اُٹھنے کی بھی ایک ترکیب بتائی ہے۔

وَاللّٰہُ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰہُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا کَذٰلِکَ النُّشُوْرُ ۝

(سورہ فاطر۔ آیت ۸ - ۹)

اور اللہ وہ ہے جس نے بھیجا ہواؤں کو۔ پھر اُٹھایا بادلوں کو۔ پھر ہانک لاتے ہیں اس کو طرف شہروں کے۔ پس زندہ کیا ہم نے اس سے زمین کو پیچھے موت اس کی کے۔ اسی طرح مُردے اُٹھائے جائیں گے۔

مشکوۃ کتاب فتن باب نفخ فی الصور میں مذکور ہے۔

قال ولیس من الانسان شئی لا یبلی الا العظما واحدہ وھو عجب الذنب ومنہ یرکب الخلق یوم القیامۃ

کہا۔ اور نہیں انسان میں سے کوئی چیز جو نہ پرانی ہو سوائے ایک ہڈی کے اور وہ ہے ریڑھ کے نیچے کی ہڈی اور اس سے خلق کی ترکیب ہوتی ہے روز قیامت۔

کہا جاتا ہے۔ کہ یہ ہڈی یوم آخر تک گلنے سڑنے بغیر محفوظ رہیگی۔ یہ بیج کا کام دے گی۔ جس سے سارا جسم تازہ کیا جائیگا۔ یہ کام چالیس دن کی بارش سے ہوگا۔ جو اللہ تعالیٰ بھیجے گا۔ جو زمین کو آٹھ بالشت تک ڈھانپ لے گی۔ اور اس کے عمل سے جسم پودوں کی طرح سے اُگ آئیں گے۔

یہ یوم قیامت کا آغاز ہے۔ اس کی میعاد دو سورتوں میں ذکر کی ہے
سورہ سجدہ میں کہا ہے۔

فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (سجدہ - آیت ۴)

ایک دن میں جس کی مقدار ہزار برس ہے تمہارے حساب سے۔

تفسیر جلالین میں اس آیت پر لکھا ہے۔

مراد ہزار برس کے دن سے قیامت کا دن ہے۔

مگر سورہ معارج میں ہم ایک اور میعاد پاتے ہیں۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ ... یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا کَاَنَّھُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ ۝ (سورہ معارج - آیت ۴ -)

چڑھتے ہیں فرشتے اور روح طرف اس کے۔ اس دن میں جس کی مقدار ہے پچاس ہزار سال۔ ... جس دن نکلیں گے قبروں سے دوڑتے ہوئے۔ جیسے کسی نشانی پر دوڑتے ہیں۔

ان دو تعدادوں کے اختلاف کا ازالہ کیونکر ہو؟ پہلی تعداد کے ساتھ ایک صفت کا اضافہ کیا ہے۔ کہ وہ تعداد تمہاری گنتی کے مطابق ہے۔ ممکن ہے۔ جو عرصہ انسانوں کی گنتی میں ایک ہزار سال ہوتا ہے۔ وہ کسی اور مخلوق کی گنتی میں پچاس ہزار سال ہو جاتا ہو۔ تفسیر جلالین میں اس عقدے کو یہ کہہ کر حل کیا ہے۔

دوسری سورہ میں پچاس ہزار برس کا فرمایا۔ یہ درازی قیامت کے دن کی کافروں کو معلوم ہوگی۔

ان پچاس ہزار برس میں ہوگا کیا؟ موضح القرآن تو پچاس ہزار برس

پر کہا ہے۔
جب سے مردے نکلیں گے۔ جب تک دوزخ بہشت بھر جائیں گے۔
تفسیر حسینی میں اس مقام پر لکھا ہے۔
درعرصہ گاہ قیامت پنجاہ موطن و موقف خواہد بود۔ وخلائق را در ہر موقفے
ہزار سال باز دارند۔ و بیان مواقف در جواہر التفاسیر است۔
قیامت کے میدان میں پچاس ٹھیراؤ ہونگے۔ لوگوں کو ہر ٹھیراؤ پر ہزار
سال روکا جائیگا۔ ان ٹھیراؤں کا بیان جواہر التفاسیر میں ہے۔
اب ذرا قیامت کی کارروائی کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ چالیس دن کی
برسات سے پودوں کی طرح قبروں سے پیدا ہوئے مردہ انسان دوڑکر
عدالت کے مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ ہر ایک کو اس کی قسمت کا پرچہ ملتا ہے
چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں آیا ہے۔
وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا
يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ (سورہ بنی اسرائیل ۔ آیت ۱۳)
اور ہر آدمی کے لئے لگا دیا ہے ہم نے اعمال نامہ اس کا بیچ اس کی گردن
کے۔ اور نکالیں گے ہم واسطے اس کے دن قیامت کے ایک کتاب کہ
دیکھیگا اُس کو کھلی ہوئی۔
اس آیت پر تفسیر جلالین میں لکھا ہے۔
مجاہد نے کہا۔ کہ نہیں ہے کوئی بچہ مگر اس کی گردن میں ایک کاغذ ہوتا ہے
کہ اُس میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ کہ یہ نیک بخت ہے یا بدبخت۔
تفسیر حسینی میں اس عبارت کی تمہید میں لکھا ہے۔
در زاد المسیر از مجاہد نقل مے کند۔

زاد المسیر میں مجاہد سے روایت کی ہے۔

اِس قول کے بعد لکھا ہے۔

یعنی آنچہ تقدیر کردہ اند از روز ازل از کردار او - لازم ساختہ اند در گردن او - یعنی او را چارہ نیست ازاں۔

یعنی جو تقدیر روز ازل سے اس کے اعمال کی کر دی - وہ اُس کی گردن میں لازم کر دی - یعنی اُسے اس سے چارہ نہیں۔

در عین المعانی گفتہ - کہ طائر آں کتاب است - کہ روز قیامت پراں پراں بدست بندہ آید۔

عین المعانی میں کہا ہے - کہ طائر وہ کتاب ہے - جو قیامت کے دن اُڑتی اُڑتی بندہ کے ہاتھ آئے گی۔

ہر انسان کے اعمال ازل سے مقرر ہیں - اٹل تقدیر نے فالنامہ بنا دیا - اس میں ہیر پھیر تو ہو نہیں سکتی - اس کے مطابق ہی ہر بندے نے عمل کیا ہوگا - اب وہ اعمالنامہ اس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔

وَوُضِعَ الْکِتٰبُ ۔ (سورہ زمر - آیت ۶۷)

اور رکھے جائیں گے اعمالنامے۔

اِس اعمالنامے کے دینے میں بھی بہشتیوں اور دوزخیوں کی تمیز ہو گی۔ چنانچہ سورہ حاقہ میں کہا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیْنِہٖ فَیَقُوْلُ هَاؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَہْ ۔ ۔ ۔
وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِشِمَالِہٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَہْ ۝

(سورہ حاقہ - آیت ۱۹ - ۲۵)

پس جس کے دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ دیا جائیگا - پس کہیگا - لیجئے پڑھو میرا

اعمالنامہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اور جس کو اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا پس کہیگا۔ اے کاش نہ ملتا میرا اعمالنامہ۔

اِس دینے کے انداز سے ہی فیصلے کا پتہ تو لگ ہی گیا۔ اب آگے اور کارروائی سے کیا غرض؟ دوزخ والے دوزخ کے لئے۔ بہشت والے بہشت کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر ضابطہ پھر ضابطہ ہے۔ اسے اللہ میاں بھی حذف نہیں فرماتا۔

اِدھر تو ان اعمالناموں کو ازلی ٹھیرایا۔ اب کہتے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ (سورہ نسا۔ آیت ۷۹)

اور اللہ لکھتا ہے۔ جو وہ ٹھیراتے ہیں۔

تفسیر حسینی میں اس پر تحریر کیا ہے۔

خدا مے نویسد در لوح محفوظ یا کرام الکاتبین بامر خدا مے نویسند

خدا لوح محفوظ میں لکھتا ہے۔ یا کرام الکاتبین خدا کے حکم سے لکھتے ہیں

ازلی تحریر کو پکا کیا جاتا ہے؟ یا نئی تحریر کی جاتی ہے؟ شاید پنسل کے لکھے پر سیاہی یا کوئی رنگ چڑھایا جاتا ہو۔ ایسی یادداشتیں رکھنے کی اُنہیں ضرورت ہوتی ہے۔ جنہیں بھُول جانے کا خوف ہو۔ عالم کل اللہ میاں کو اتنا دفتر رکھنے کی ضرورت کیا پڑی؟ مُفت کی کرام الکاتبین کی محنت۔ اس قدر سامان کا بے ضرورت صرف کیوں کیا جاتا ہے؟

پھر یہ بھی تو ضروری نہیں۔ کہ یادداشتیں اعمال کا صحیح روزنامچہ ہوں کیونکہ ایک اور جگہ فرمایا ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (سورہ رعد۔ ع ۶)

اور مٹا دیتا ہے اللہ جو چاہتا ہے۔

تفسیر حسینی میں اس آیت پر لکھا ہے۔

آنچہ از بندہ صادر شود۔ از اقوال و افعال ہمہ را بنویسند۔ و آں دفتر را بموقف عرض رسانند۔ حق سبحانہٗ قولے و فعلے کہ ثوابے و خطائے بداں متفرع نیست۔ محو کند۔ و باقی را مثبت بگذارد۔ یا سیات تائب را محو کند

جو کچھ بندے سے صادر ہوتا ہے۔ اقوال یا افعال کی صورت میں۔ وہ سب لکھتے ہیں۔ اور اس رجسٹر کو پیش کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ اس قول اور فعل کو کہ ثواب یا خطا اس پر متصور نہیں۔ مٹا دیتا ہے۔ اور باقی کو لکھا رہنے دیتا ہے۔ یا توبہ کرنے والے کی برائیوں کو مٹا دیتا ہے۔

جب یہ اختیارات سلطانی بھی کام میں آتے رہتے ہیں۔ تو لکھنا بالکل بیسود ہے۔ مگر ہاں کچہری کا دستور پورا ہونا چاہیئے! اللہ میاں نے خود یا فرشتوں نے لکھا۔ اور اللہ میاں نے اس میں ترمیم کر کے تصدیق فرما دی۔ لیکن کچہریوں میں تو گواہ بھی ہوتے ہیں۔ اللہ میاں کی کچہری بغیر گواہوں کے کیسے رہے؟ فرمایا ہے۔

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ　　(بنی اسرائیل۔ آیت ۶۸)

جس دن بلائیں گے سب لوگوں کو معہ ان کے پیشواؤں کے۔

وَجِائَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ

(سورہ زمر۔ آیت ۶۹)

اور لائے جائیں گے پیغمبر اور گواہ۔ اور فیصلہ کیا جائے گا ان میں انصاف سے۔

تفسیر حسینی کے مطابق گواہوں سے

مراد امت محمد است

مراد حضرت محمد کی امت ہے۔

لیکن نہیں - گواہ کچھ اور بھی ہیں -

یَومَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(سورہ نور - آیت ۲۴)

جس دن شہادت دیں گے ان پر ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ - اور ان کے پاؤں - جن سے کردہ عمل کرتے تھے -

وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (سورہ یٰس - آیت ۶۳)

اور گواہی دیں گے پاؤں ان کے جو کچھ وہ کماتے تھے -

حَتّٰى اِذَا مَا جَاءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ط قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حم سجدہ - آیت ۱۹-۲۰)

حتیٰ کہ جب جائیں گے پاس اس کے - گواہی دیں گے اُن پر کان اُن کے - اور آنکھیں اُن کی اور چمڑے اُن کے - جو کچھ کرتے تھے - اور وے کہیں گے چمڑوں سے اپنے - کیوں گواہی دی تم نے اوپر ہمارے - وہ کہیں گے - بلوایا ہم کو اللہ نے - جس نے بلوایا ہر چیز کو -

یہ آخری گواہیاں خوب ہیں - اجسام کے یہ اعضا قبر کی مٹی میں مٹی ہو چکے - یا فقط ریڑھ کی ہڈی کا نچلا حصہ - اس پر بارش پڑنے سے جسم اُگا - قیامت کی کچہری میں پہنچے - تو ان اعضا کو نطق بھی عطا ہو گیا - کیا یہ وہی اعضا نہیں جو دُنیا میں تھے؟ مگر اب تو مٹی نہیں رہی - بنائیں گے کس سے؟ اگر یہ تمام عبارت استعارہ ہو - تو وہ تو روز ہو ہی رہا ہے - مجرم کی آنکھیں جرم کی اقبالی ہوتی ہی ہیں - قیامت میں خاص کیا ہوتا ہے؟ چمڑا کہتا ہے - مجھے بلواتا ہے اللہ - کیا وہی بات بلواتا ہے جو چاہتا ہے - یا بدلنے

کی آزادی ہے؟ آزادی نہیں تو گواہی قابل اعتبار نہ رہی۔ اللہ میاں کی مرضی ہو۔ تو کیا خود فاعل اپنے جرم کا اقبال کرنے کو تیار نہیں؟ وہ غریب تو اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں ملنے ہی سے کانپ گیا تھا۔ پھر اور شہادت کی ضرورت کیا پڑی تھی؟ کیا محض ضابطہ پورا کرنا تھا؟ یہ ضابطہ کم دانوں کے لئے ہوتا ہے۔ ہمہ دان کا اپنا علم کافی ہے۔ پھر یہاں تو ازل سے ہی ہر ایک کے اعمال کی ڈائری خود بنا دی ہے۔ جس سے سرِ مُو اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد کرام الکاتبین ہیں۔ وہ اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ جو کچھ بھی ازل کی تحریر ہے۔ وہ کماحقہ عمل میں آتی ہے۔ ممکن ہے۔ وہ دوسرا رجسٹر تیار کرتے ہوں۔ جس کا بعد میں لوحِ محفوظ سے مقابلہ کیا جاتا ہو۔ پھر اللہ میاں اپنے دستِ خاص سے اس میں شکست ریخت کرتے ہیں انبیا اور ان کی اُمت کی گواہی الگ ہے۔ پھر ہر فاعل کے اعضا کو زبان بخشی جاتی ہے۔ اور وہ فاعل کی مرضی کے خلاف اس پر پرچہ چاک کرا دیتے ہیں۔ گواہی کے مضمون کا خود فیصلہ کرتے ہیں یا کوئی اور؟ اس میں شک ہے۔ کچہری کی کارروائی مکمل ہے۔ ہاں! کمی ہے۔ تو فقط وکیل اور دلیل کی۔ بھلا ہمہ دان منصف کو اس کی کیا ضرورت؟ مگر پھر دیگر ضابطے کی بھی کیا ضرورت؟ اور اگر یہ ضرورت کا سوال ایک دفعہ چل پڑے۔ تو پھر ابتداہی میں عدم سے وجود میں لانے کی بھی کیا ضرورت؟ برائی کرانے کی بھی اچھے بھلے اللہ میاں کو کیا ضرورت؟ ابتدا سے آخر تک سب اللہ میاں کی مرضی کے کرشمے ہیں۔ اگر اب ان گواہوں کے بعد فاعل کو بولنے کی اجازت ہو تو وہ کہے۔ مجھ سے کرایا اللہ نے جو کرانا ہے سب سے۔ ع

وُہی قاتل۔ وہی مخبر ہے وہی منصف بھی اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پہ؟

اعضا نے گواہی دینے کو دے دی ۔ اب ان پر بھی فتویٰ صادر ہوتا ہے ،
فرمایا ہے ۔

کَلَّا لَئِن لَّمْ یَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِیَةِ ۝ نَاصِیَةٍ کَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ

(سورہ علق ۔ آیت ۱۵ ۔ ۱۶)

البتہ گھسیٹیں گے ہم اس کو ساتھ پیشانی کے ۔ وہ پیشانی کہ جھوٹی ہے خطاکار

اوپر انسان کو اس کے اعضا سے الگ کر دیا تھا ۔ قیاس ہوا تھا ۔ کہ آریہ فلسفے کی طرح قرآن شریف بھی انسان کو مدرک فاعل اور اس کے اعضا کو غیر مدرک ذرائع قرار دیتا ہے ۔ مگر پیشانی کو سزا دیئے جانے سے گمان ہوتا ہے ۔ کہ شاید دہریوں کے عقیدے کے مطابق یہاں بھی دماغ کو فاعل مانتے ہوں ۔ کیونکہ روح کی ماہیت قرآن شریف میں بیان نہیں فرمائی ۔ اور اگر پیشانی بھی مثل دیگر اعضا کے آتما سے جدا ہے ۔ تو اس غریب کو سزا کیلئے منتخب کیوں کیا ؟ کیا سزا دیتے وقت دوسرے اعضا کو جو گواہ سلطانی بنے تھے ۔ رہا کر دیا جائیگا ؟ دنیوی عدالتوں میں یہ دستور ہے ۔ الہٰی عدالت میں بھی شاید ہو ۔ اس حالت میں دوزخ کی تکلیف اٹھانے والے انسان کی شکل و ہیئت کیا ہوگی ؟ زبان ندارد ۔ کان ندارد ۔ آنکھیں ندارد ۔ چمڑا ندارد ۔ پاؤں ندارد ۔ بغیر چمڑے کے پیشانی ہوگی ۔ جو گھسیٹی جائیگی ۔ اگر کچھ اعضا اس لئے چھوٹ جائیں ۔ کہ انہوں نے سچی گواہی دی ہے ۔ اور کچھ اس لئے کہ ان کا غلط استعمال ہوا ہے ۔ تو سزا بھگتنے کے لئے روح ہی رہ جائے ۔ جو فلسفے کے نزدیک معقول ہو ۔ غیر مدرک کی سزا کے کیا معنے ؟

بہشت

اہل اسلام کے ہاتھوں میں اپنے مذہب کی طرف تحریص دینے کا ذہنی آلہ بہشت کا تصوّر ہے۔ یہ وہ مقام ہے۔جہاں ہر ایک پارسا مسلمان جائیگا۔وہاں تکلیف کا وجود تک نہیں۔آسائش ہی آسائش ہے اور وہ آسائش بھی ایسی کہ کبھی ختم نہ ہوگی۔فرمایا ہے۔

اَلَّذِی اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ (سورہ فاطر۔آیت ۳۵)

جس نے اُتارا ہمیں ہمیشہ رہنے والے گھر میں۔نہیں لگتی ہم کو بیچ اس کے محنت۔اور نہیں لگتی ہم کو بیچ اس کے ماندگی۔

وہاں کی آسائش بغیر محنت کے حاصل ہوتی ہے۔اور اس کا مزا کرکرا نہیں ہوتا۔پھر وہ لا انتہا ہے۔پھر فرمایا ہے۔

اولٰئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ (بقر۔۷۵)

رہنے والے جنّت کے وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْم

(سورہ نسا۔آیت ۱۲)

یہ ہیں حدیں اللہ کی اور جو اطاعت کرے اللہ کی اور اُس کے رسول کی۔داخل کرے گا اس کو بہشتوں میں چلتی ہیں نیچے اُن کے نہریں۔ان

میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (سورہ ہود۔ آیت ۱۰۶-۱۰۷)

اور جو لوگ کہ نیک بخت کئے گئے ہیں۔ پس بہشت میں ہیں۔ جب تک کہ رہیں زمین اور آسمان

قیامت کے بیان میں صُور پھونکے جاتے ہی آسمان اور زمین کے زائل ہو جانے کا بیان کیا جا چکا ہے۔ مگر یہاں فرمایا ہے۔ کہ بہشت میں قیام اسی وقت تک رہیگا۔ جب تک زمین اور آسمان رہیں گے۔ بہشت میں جانا تو ہوگا ہی قیامت کے بعد۔ ان دو عبارتوں کے مفہوم میں صاف تضاد ہے۔ زمین ایک مرکب جسم ہے۔ اور ہر مرکب فانی ہوتا ہے اگر بہشت میں قیام کی میعاد زمین کے قیام تک ہے۔ تو بہشت جاودان نہ رہا۔ قطع نظر اس سے زمین کا بہشت سے تعلق بھی کیا؟ کیا اہل جنّت زمین ہی پر رہیں گے؟ یا کوئی اور مخلوق زمین پر لائی جائیگی؟

ہم نے اُوپر عرض کیا تھا۔ کہ قرآن میں نیکی کا اجر دُگنا کیا جانے کا وعدہ ہے۔ اگر کوئی انسان ساری عمر نیکی ہی کرتا جائے۔ تو بھی اس کی مقدار محدود ہی رہیگی۔ اگر اس محدود مقدار کو دُگنا کر کے اس کے تمتع کی میعاد بے انتہا زمانہ کر دیا۔ یعنی بے انتہا زمانہ میں ساری متمتع لذت نیکی کی دوچند رہی۔ تو بہشت کے مزے میں کیا مٹھاس رہیگی؟ مٹھاس کا سوال جُدا ہے۔ دوگنا کے معنی شاید دگنا نہ ہو۔ کئی گُنا ہو۔ آؤ۔ پہلے یہ تو دیکھیں۔ کہ جنّت کی لذّات میں ملنا کیا ہے؟ فرمایا ہے۔

جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۝ مُتَّكِئِیْنَ فِیْهَا یَدْعُوْنَ فِیْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِیْرَةٍ

وَّشَرَابٍ ○ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ (صٓ - ۵۰-۵۱)

باغ ہیں ہمیشہ رہنے والے۔ کھلے ہیں دروازے ان کے لئے۔ اس میں تکیہ لگائے ہوئے ہونگے۔ منگوائیں گے بہت میوے اور پینے کی چیزیں اور نزدیک ان کے ہونگی نیچی نگاہ والی ہم عمر۔

کھلے دروازے بتاتے ہیں کہ کوئی غیر محدود چیز نہیں۔

فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ... ... عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۙ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ۙ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۙ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۙ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ۙ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۙ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ○ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ○ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ○ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ... ... وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ○ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۙ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ○ عُرُبًا اَتْرَابًا ○ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ

(سورہ واقعہ - آیات ۸-۱۰ تا ۲۴-۳۴-۳۵-۳۶-۳۸)

پس صاحب داہنے ہاتھ کے۔ کیسے ہیں داہنے ہاتھ کے؟ ... ... اوپر جڑاؤ تختوں کے بیٹھے ہیں تکیہ لگائے۔ گرد پھریں گے ان کے لڑکے ہمیشہ رہنے والے ساتھ آبخوردں کے اور آفتابوں کے اور صاف شراب کے پیالوں کے اور نہ دکھے سر اور نہ بکنا ان کو۔ اور میوے اس قسم کے کہ پسند کریں اور گوشت پرندوں کا اس قسم سے کہ چاہیں۔ اور واسطے ان کے عورتیں ہیں۔ گوری بڑی آنکھوں والی۔ جیسے موتی چھپے ہوئے۔ ... ... اور بچھونے بلند۔ تحقیق ہم نے پیدا کیا ان عورتوں کو ایک قسم پر۔ پس کیا ہے ہم نے ان کو باکرہ۔ خاوند والی۔ ہم عمر واسطے

داہنے طرف والوں کے

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ یَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـٕیْنَ فِیْهَا عَلَى الْاَرَآىٕكِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ٥ (سورہ کہف - آیت ۳۰)

یہ لوگ ہیں - واسطے ان کے ہیں باغ ہمیشہ رہنے والے - چلتی ہیں نیچے ان کے نہریں - پہنائے جائیں گے گہنا ان میں کنگن سونے کے اور پہنیں گے کپڑے سبز پتلے - اور گاڑھے ریشم کے - وہاں تکیے لگا کر تختوں پر بیٹھینگے اچھا ہے ثواب اور اچھی آرام گاہ -

یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ ٥ بَیْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ .. ..
.. وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِیْنٌ ٥ كَاَنَّهُنَّ بَیْضٌ مَّكْنُوْنٌ

(سورہ صافات - آیات ۴۴-۴۵)

پھرایا جائیگا ان پر پیالہ شراب لطیف سفید کا جو لذیذ ہے پینے والوں کے لئے .. .. .. ان کے پاس ہونگی نیچی نظروں والی - بڑی آنکھوں والی - جیسے انڈے چھپے ہوئے

ان حوروں کے ساتھ تعلق کیا ہوگا ؟ فرمایا ہے -

وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ (سورہ دخان - آیت ۵۴)

اور بیاہ دیں گے ہم اُن کو ساتھ موٹی آنکھوں والی حوروں کے -

باقی رہے غلمان - ان کا تعلق غلام کا معلوم ہوتا ہے - کہا ہے -

وَ یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَیْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا - .. .. وَ حُلُّوْۤا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَ سَقٰهُمْ

وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ (سورہ دہر آیات ۱۹-۲۱)

اور پھریں گے ان کے گرد لڑکے ہمیشہ رہنے والے - جب تو دیکھیگا ان کو - گمان کرے گا موتی بکھرے ہوئے - اور پہنائے جائیں گے کنگن چاندی کے - اور پلائے گا اُن کو - رب اُن کا شراب پاکیزہ -

اللہ میاں کے ہاتھ میں چیز اچھی دی ہے - مگر شاید دُنیوی شراب اور اُخروی شراب میں فقط نام کی مشابہت ہو - نہیں - کہا ہے -

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ط وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (بقر - آیت ۲۶)

اور خوشخبری دے اُنہیں جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں - کہ ان کے لئے باغ ہیں - جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں - جب اُنہیں دیا جائے گا - اس ثمرے حصہ جو اُن کا رزق ہے - تو کہیں گے - یہ وہی ہے - جو ہمیں پہلے دیا گیا تھا - اور وہ اس کے متشابہ دیئے جائینگے اور ان کے لئے عورتیں ہیں پاکیزہ - اور وہ وہاں ہمیشہ رہنے والے ہیں -

پاکیزہ کی تشریح تفسیر جلالین میں کی ہے -

وہ حیض اور پلیدی سے پاک ہیں -

ان تمام لذات کو دیکھ کر ایک امیر کے محل کا تصور ہو سکتا ہے - کہ ان میں نہریں - سونے اور چاندی کے زیور - پتلے اور گاڑھے ریشم کے کپڑے - جڑاؤ تخت - میوے - شراب - پرندوں کا گوشت - لڑکے

جیسے موتی بکھرے ہوئے۔ شراب کے پیالے ہاتھوں میں لئے پھر رہے ہیں۔ پاس عورتیں بیٹھی ہیں۔ موٹی آنکھوں والی۔ گوری۔ خوبصورت۔ جیسے موتی یا انڈے چھپے ہوئے۔ ان سے نکاح بھی کر دیا گیا۔ محض دُنیوی عیش و عشرت کا کمال ہے۔ ہاں! موجودہ زمانے کی سائنس کی کوئی ایجاد وہاں نہیں رکھی۔ سو اُس وقت کے عرب میں ایسی کوئی چیز تھی نہیں۔ اور پھر صاف کہا ہے۔ کہ دُنیا کی نعمتوں جیسی ہی وہ نعمتیں ہیں۔ ممکن ہے کسی عشرت پسند کے مُنہ میں ان تذکرات کے سننے سے پانی بھر آئے۔ رُوحانی مشاغل کے لوگ ناک بھوں سکیڑ لیں گے۔ محسوسات بطور خود کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ ان کا کسی انداز کے اندر اندر تمتع مفید ہے۔ جائز ہے۔ لیکن یہاں تو کچھ انداز ہی مقرر نہیں۔ اور پھر وہ لذت تو تفریح طبع کا باعث ہوتی ہے۔ جس کے لئے محنت کرنی پڑے۔ مگر بہشت میں محنت کا نام و نشان ہی نہیں۔ جب نعمتیں دُنیا کی سی دی ہیں۔ تو ان میں رہ کر صحت کے محفوظ کرنے کا سامان بھی تو ویسا ہی کر دینا تھا۔ محنت مشقت امیری کے اخلاقی قبوحات کی مصلح ہوتی ہے۔ بہشت میں اس قباحت کا سامان تو موجود ہے۔ مگر مصلح ندارد ہے۔ اسی لئے رشی نے فرمایا ہے۔ "ہمیشہ کا سُکھ بھی دُکھ ہو جاتا ہے" (چودھواں سملاس۔ فقرہ ۱۰۴) بہشت میں کھانے پینے اور شادی کا ذکر تو کر دیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے۔ کہ عورت مرد کے تعلقات وہاں رہتے ہیں۔ لیکن جو شادی کا ثمر ہے۔ یعنی اولاد۔ وہ کالعدم ہے۔ جلالین نے حیض کو پلیدی سمجھ کر اُڑا دیا ہے۔ لڑکے وہاں پہلے ہی موجود ہیں۔ اور انہیں ہمیشہ لڑکے ہی رہنا ہے بھلا یہ کس لئے؟ خدمت جو ان سے ہی کر سکتے تھے۔ بوڑھے بھی۔ بکھرے

ہوئے موتیوں سے وہاں کیا غرض ہے ۔ جن کے ذمہ خدمت بھی یہ لگی ہے
کہ پیالے بھر بھر کے پلاتے رہو؟

لذات مادی ہیں ۔ تو ان کے مادی لوازمات سے بھی قطع نظر ہونا
مشکل ہے ۔ اتنے کھانے پینے کا ۔ جہاں محنت کا موقع نہیں ۔ صاف نتیجہ
ہے بیماری ۔ وہ ہوگی یا نہیں ؟ بول و براز ہوگا یا نہیں ؟ ہوگا ۔ تو اس
کے اٹھوانے وغیرہ کا سامان بھی کر دیا ہوگا ۔ اس سے بڑھ بھی اگر انھیں گوشت
کھانا ہے تو ذبح خانہ بھی چاہئے ۔ یہ ذبح کرنے کی خدمت کس کے سپرد ہوگی ؟
اور خون اور دیگر فضلات کیا سڑاند پیدا نہ کرینگے ؟ بھنگی اور جاروب
کش کن میں سے بنائے جائیں گے ؟ بہشتیوں یا دوزخیوں میں سے ؟ مولانا
ثناء اللہ فرماتے ہیں ۔ یہ بیگار کافروں سے لی جائیگی ۔ اچھا ہے کسی بہانے سے
بہشت میں تو جائیں گے ۔ مگر کیا دوزخ ان کے ساتھ جائیگا ؟ یا تھوڑی دیر
کے لئے اس سے رہائی ملیگی ؟ مردوں کے لئے تو یہ سارا سامان کر دیا ۔ مگر
جائیں گی مومنات بھی ۔ کیونکہ کہا ہے ۔

وَعَدَ اللّٰہُ المومنین والمومناتِ جنٰتٍ (سورہ توبہ - ۶۹)

اور وعدہ کیا ہے اللہ نے مومن مردوں اور عورتوں سے جنّت کا ۔

ان کا بیاہ ہوگا یا کنواری رہینگی ؟ اور وہ بھی شراب طہور اور لحم طیر سے
مستفیض ہوا کریں گی یا نہ ؟ حوریں اُن کے کس کام آئیں گی ؟ نکاح کے ؟
ممکن ہے ۔ کوئی صاحب کہیں ۔ کہ مومنات کا بیاہ اپنے سابقہ خاوندوں
سے ہوگا ۔ کئی ایسی مومنات بھی تو ہو سکتی ہیں ۔ جو نکاح سے پیشتر وفات
پا چکی ہوں ۔ مگر ہاں ! کثرت ازدواج تو وہاں بھی جائز ہے ۔ اگر منکوحہ
عورت اور خاوند کے اعمال میں فرق ہونے کی وجہ سے ایک بہشت میں

اور ایک دوزخ میں چلا گیا تو ؟ بیا ہیوں کو بیوہ قرار دینا تو شاید ظلم ہے۔ بُوڑھے مومنوں کا ان کی ہم عمر حُوروں سے بیاہ کر دینے سے کیا فائدہ ہے ؟ جسم وُہی دُنیا والا ہی پھر سے پیدا کیا جاتا ہے تو [illegible] کے اعضا کا تو یہاں کافی انزال ہو چکا ہوگا۔

یہ ہو ئیں بہشت کی اخلاقی اور تمدنی مشکلات۔ اب اس پر ایک فلسفیانہ نظر بھی ڈال لیں۔ کہا ہے۔ کہ غلمان اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی حالت حُوروں کی ہے۔ اور دونوں ذی روح ہیں۔ سوال یہ ہوتا ہے۔ کہ جب اوپر بہشت کے قیام کو

جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (سورہ واقعہ)

کیئے گئے اعمال کی جزا کہا ہے۔ تو حُوریں اور غلمان وہاں کس عمل کی بدولت پہنچے ہیں ؟ مولانا ثناء اللہ لکھتے ہیں۔ بُرائی نہ کرنے کی وجہ سے۔ مولانا ساتھ ہی فرماتے ہیں۔ کہ کم عمر لڑکے جو سن رشد کو پہنچنے سے پہلے مر جاتے ہیں وہ بھی جنتی ہوتے ہیں۔ تو کیا یہ سب سے بڑے ثواب کا کام نہیں۔ کہ کسی کو سن رشد تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔ اس سے پہلے ہی پہلے اسے جنت بھیج دیا جائے۔ ذوی العقول مخلوق میں ایک جنس کو بغیر عمل کے جنت میں بسانا اور ایک اور قسم پر اعمال کی پابندی لگانا انصاف نہیں۔ اب ایک اور سوال یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ کیا یہ حوریں اور غلمان قیامت کے بعد پیدا ہونگے۔ یا وہاں پہلے سے موجود ہیں ؟ قرآن میں آدم کے بہشت میں جانے کا ذکر ہے سو وہ بہشت مع ساز و سامان اس وقت ہوگا۔ ایک اور مقام پر فرمایا ہے

فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ
وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ٥

اور اس میں نہریں ہیں پانی کی جو سڑتا نہیں - اور نہریں ہیں دودھ کی -
جس کا ذائقہ نہیں بدلتا - اور نہریں ہیں شراب کی جو لذیذ ہے پینے والوں
کو اور نہریں ہیں شہد صاف کی - (سورہ محمد - ع ۲ - آیت ۱۵)

"ہیں" کے معنی ہیں - اس وقت موجود ہیں - اس سے بھی زیادہ صریح
حوروں کا مندرجہ ذیل ذکر ہے -

لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ (سورہ رحمن - ع ۶)

اور انہیں نہیں چھوا قبل کسی انسان نے اور نہ جن نے -

اگر حوریں پیدا ہوتے ہی بہشتی مردوں کے حوالہ کر دی جائیں - تو یہ کہنے
کی ضرورت کیا تھی - کہ وہ اچھوتی ہیں ؟ اور پہلے سے موجود ہونے کی صورت
میں تو قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے - کہ وہ وہاں کیا کرتی ہیں ؟ اگر ان کی پیدائش
کا مطلب مومنوں کی خوشنودی کے سوا اور نہیں - تو پہلے کی زندگی فضول
ہوئی - کیونکہ قیامت سے پہلے وہاں اللہ کی ذات کے سوا اور کوئی ہے نہیں
اسی بہشت کی ایک جھانکی کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ
مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ ○

(اللہ نے) کہا داخل ہو جنت میں - کہا کاش میری قوم جانتی کہ بخشا مجھے
میرے رب نے اور بنایا مکرموں میں سے -

مفسر اس واقعہ کو ایک مومن کا قصہ بتاتے ہیں - جو آج سے قبل بہشت
میں جا چکا ہے - تب تو بہشت پہلے سے ہے وہاں والوں کو کن اعمال کے بدلے
وہاں کی زندگی ملی ہے ؟ برے اعمال کرنے والوں نے بھی کب کہا تھا -
کہ ہمیں برے اعمال کرنے دو ؟ ایک پیدا کرو - پھر برا پیدا کرو - تقدیر کے

زور سے بُرے اعمال کراؤ۔ پھر ہمیشہ کے لئے دوزخ میں بھی بھیج دو۔ اس پر دعویٰ یہ کہ ہم ظلم نہیں کرتے!

بھولے بھالے کم عقل دیہاتی یا صحرائی جنہوں نے باغ کی شکل نہ دیکھی ہو۔ عسرت میں زندگی بسر کرتے ہوں۔ افلاس کی وجہ سے نہ گھر بار کا سُکھ نصیب ہو۔ نہ پیٹ بھر کھانے پینے کو ملے۔ ان کے لئے جنت کی ٹھنڈی ہوائیں۔ لذیذ کھانوں اور سفید لطیف شربتوں۔ کنگنوں اور نیلے اور گاڑھے ریشمی کپڑوں اور اگر شہوانی حِس زیادہ تیز ہوئی۔ تو ہم عمر حُسن کی پتلیوں کی کشش ہو سکتی ہے۔ مگر جن لوگوں کو یہ لذات یہاں نصیب ہیں۔ وہ ان کے تلخ اثرات سے واقف ہی ہیں۔ لاکھ کہو بہشت کی شراب سے سر میں درد نہ ہوگا۔

مگر یہ جو فرما دیا ہے۔ کہ وہ مزے

اتوا بہ مُتشابِہاً (سورہ بقر)

یہاں کے مزوں سے ملتے جُلتے ہیں۔ وہ کہاں ماننے لگے۔ کہ شراب اور سر کا درد نہ لائے۔ بکواس پر مائل نہ کرے! چلو۔ ایک شراب میں یہ خصوصیت سہی۔ باقی حُوریں اور غلمان اور پرندوں کا گوشت۔ اور ریشم اور کنگن۔ ان کا انجام تو وہاں بھی وہی ہوگا۔ جو یہاں ہے۔ اور یہاں پھر ان لذات کا کچھ انداز ہے۔ وہاں انداز نہیں اور انتہا کبھی نہیں ہوتی۔ کسی ذی شعور کے لئے یہ بھی مُعمّا ہے۔ کہ جو چیز یہاں انداز کے اندر برتی ہوئی خود اسلام میں منع ہے۔ مثلاً خمر۔ وہ بے انداز

وَ اَنھٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ (سورہ محمد۔ آیت ۱۵)

ہوتے ہی کیا ثواب بن جائیگی؟ یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ چاہے جائیں

سارے پرہیزگار رہی۔ مگر پھر ایک پرہیزگار اور دوسرے پرہیزگار کی پرہیزگاری کے درجے میں فرق ہے۔ سب کو ایک سی نعمتیں کس حساب سے مل جائینگی؟ کیا قرآنی حساب میں پرہیزگاری کے ہر درجہ کا دوگنا بہشت ہے۔ فرمایا یہ بھی ہے۔ کہ ہر گناہ معاف کیا جا سکتا ہے۔ گناہ معاف کرنے کے معنی ہیں سزا نہ دینا۔ مگر جو اس گناہ سے طبیعت میں گناہ کی رغبت پیدا ہوگئی۔ وہ تو بغیر ریاضت کے محو نہیں ہوتی۔ ان سب طرح کی طبیعتوں کے لوگوں کو ایک سی عشرات کس میزان سے ملیں گی؟ اور جو فرق کیا۔ تو غیر مساوات بھی تو ایک دُکھ ہے۔ چھوٹا امیر بڑے امیر سے غریب ہے۔ کم راحت میں رہنے والا زیادہ راحت میں رہنے والے کی نسبت رنج میں ہے۔ اور اس غیر مساوات کے ہوتے اگر گناہ معاف کرائے ہوئے چور اور اُچکے بھی وہاں پہنچے۔ تب تو نہ جانے۔ وہاں کیا کیا سیاسی انتظامات کرنے کی ضرورت پیش آئے؟

کوئی بھلا آدمی بہشت کو جس پہلو سے دیکھے۔ اِس سے متوحش ہوتا ہے کشش محسوس نہیں کرتا۔ اور جن بزرگوں کو الہیات کی چاٹ لگی ہے۔ ان کی نظر میں دُنیوی یا ان جیسی اخروی عشرات کی حرص گویا ایک پھندا ہے۔ جس سے وہ دُور ہی دُور رہنا چاہتے ہیں۔ ہم حیران ہیں۔ کہ قرآن نے یہ لذّات کا جال لگایا کس کے لئے ہے؟ پرہیزگاروں کو ہدایت کرنی تھی۔ اور سامان جو اکٹھا کیا ہے۔ شاہدین ہی کے موافق حال ہے۔ ذوق نے کہا ہے۔

کب حق پرست زاہد جنّت پرست ہے حُوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

اور غالب فرماتے ہیں۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

مذہب اور بہشت کرے حوریں اور غلمان! اور جڑاؤ تخت! اور شراب طہور! اور لحم طیور! غالب نے اس بہشت کی حقیقت ہی تسلیم نہیں کی محض وہم کی تصویر قرار دے کر کہا ہے

خوب معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب! یہ خیال اچھا ہے

ہم اتنا بھی نہیں مانتے - اس شراب و کباب - حور و قصور سے دل بھی بہلایا - تو کچھ روحانی علو کا سامان نہ کیا - اس سے اخلاقی نقطہ نظر سے تنزل ہی ہوگا - گناہ ایک جسمانی ہوتا ہے - دوسرا ذہنی - حور و قصور شراب و کباب کا تصوّر ذہنی گناہ ہے - اس سے یکسو ہونے - اس سے اونچے اُٹھنے کا نام مذہب ہے - اور قرآن نے اسی کو

فَوْزُ الْعَظِیْم - (سورہ نسا)

بڑی کامیابی قرار دیا ہے - کیا کہیں!

ادھر ہم بہشت کی عشرتوں کی تفصیل دیکھتے ہیں - ادھر پڑھتے ہیں -

وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّ لَھُمْ جَنّٰت (سورہ بقر)

اور خوشخبری دے انہیں، جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل کئے اچھے ان کے لئے جنتیں ہیں۔

کہاں سفید ریش - مونچھیں کٹوائے - سر منڈے بزرگ تسبیح ہاتھ میں دن رات مصلّے پر سر جھکائے رہنے والے - نمازی - روزہ دار - کہاں موٹی موٹی - کالی آنکھوں والی گوری حوریں - بکھرے ہوئے موتی سے لڑکے جو شراب کے آبخورے اور آفتابے لئے پھر رہے ہیں - جڑاؤ تخت

اور ریشم۔ شراب اور کباب! معلوم ہوتا ہے۔ حضرات مولاناؤں سے مذاق ہوا ہے۔ ذوق کی بات مان لی گئی ہے۔

ذوق! جو مدرسے کے بگڑے ہوئے ہیں مُلّا
ان کو میخانے میں لے آؤ سنور جائیں گے

ایک کشش ہے۔ کہ اللہ میاں خود پلائیں گے۔ مگر نام تو پھر بھی شراب ہی ہے۔ لاکھ بکھرے موتیوں کے ہاتھ سے ہو۔ یا اللہ میاں کے دستِ خاص سے۔ مولانا لوگ انکار کر دیں گے۔ پرانوں کی روایتوں میں بڑی بڑی عظمت کے لوگوں کو ایسی ترغیبوں اور تحریصوں میں ڈالنے کا ذکر ہے۔ اس ترغیب میں غیبی ہاتھ کام کر رہا ہوتا ہے۔ مرتاض کی کامیابی اس میں سمجھی جاتی ہے۔ کہ وہ ترغیب کا شکار نہ ہو۔ نفس پر قابو پائے۔ جو یہی منشا اس قرآن کی تحریر کا ہو۔ تو مولاناؤں سے سفارش کی جائے۔ کہ بھائی! ذرا سنبھل کے رہنا۔ کسی نے ڈرتے ڈرتے کہا ہے۔

مانا کہ پہنچ جائیں گے جنت میں متقی،
پرواں یہ متقی رہیں مولیٰ! یقیں نہیں
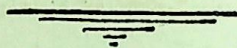
دوزخ

دوزخ بہشت کا مدمقابل ہے۔ یہ ہے کافروں کا گھر۔ غیر مومنوں کا مسکن۔ فرمایا ہے۔

وَ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ (سورہ بقر۔ آیات ۲۴۔ ۲۵)

اور اگر تم شک میں ہو اس سے جو ہم نے نازل کیا اپنے بندے پر پس لاؤ ایک سورہ اُس جیسی۔ اور بلاؤ اپنے گواہوں کو سوائے اللہ کے اگر تم سچے ہو۔ پس اگر نہ بناؤ اور تحقیق تم نہ بنا سکو گے۔ تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن ہیں آدمی اور پتھر۔ اور تیار کی گئی ہے واسطے کافروں کے

کافر اسلام کی اصطلاح میں غیر مسلم کو کہتے ہیں۔ اور یہاں سزا بیان کی جا رہی ہے محض قرآن پر ایمان نہ لانے کی۔ اگر قرآن کے الہامی ہونے کا شک ہے۔ تو اس پر دلیل مت کرو۔ ویسی سورۃ بناؤ۔ اور یہ اللہ کا حکم ہے۔ کہ نہیں بنا سکو گے۔ بس اب دوزخ کی آگ تیار ہے۔ یہ تو سوچ لینا تھا۔ کہ الہام کے اقرار میں عقلی مشکلات بھی حائل ہو سکتی ہیں۔ کیا ان کا علاج دوزخ ہے؟ سزا ہمیشہ بُرے ارادے کی ہوتی ہے۔

کوئی بغیر بُری نیت کے ایمانداری سے قرآن کے الہامی ہونے کا منکر ہو تو؟ اور وہ اخلاق کا اچھا ہو تب؟

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ - (بقر - ۴۸)

اور ڈرو اس دن سے جب کوئی جی کسی جی پر بھروسا نہ کریگا۔ نہ قبول کی جائیگی سفارش اس کی۔ اور نہ عوضانہ لیا جائے گا۔ اور نہ وہ مدد پائینگے

تفسیر حسینی میں آخری جملہ پر لکھا ہے۔

ونہ ایشاں کافراں کہ یاری دادہ شوند

اور کافروں کو مدد نہ دی جائیگی۔

آخر کیوں؟ کیا وہ اللہ میاں کی مخلوق نہیں؟ عدالت کے یہ اصول تو نہایت عمدہ ہیں۔ کہ سب اپنے اوپر آپ بھروسا کریں۔ سفارش اور عوضانہ نہ ہو۔ مگر یہ جو ادبار لکھا ہے۔ کہ

مَنْ ذَا الَّذِیْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (بقر - ۲۵۵)

کون ہے جو اس سے سفارش کرسکے مگر حکم سے اس کے۔

یہ حکم سے سفارش کرنے کے کیا معنی؟ اگر حاکم یا منصف کی اپنی مرضی بخشنے کی ہے۔ تو بخش دے۔ کسی اور پر احسان کاہے کو کرتا کہ آ سفارش کر۔ اور میں مان لوں؟ اہل اسلام ان احکام سے حضرت محمد کی سفارش کا حکم اخذ کرتے ہیں۔

آیت ۴۸ کا ترجمہ تفسیر حسینی میں یوں کیا گیا ہے۔

بترسید از عذاب روزے کہ در آں روز حق گزاری نہ کند۔ و نتواند ہیچ نفس مومنہ از نفس کافرہ چیزے را از مکافات یا

کفایت نہ کند ہیچ کس چیزے از عذاب پذیرفتہ نہ شود از نفس کافرہ - برائے او درخواست بہ آں تقدیر کہ کسے شفاعت کند و گرفتہ نہ شود ازاں نفس کافرہ فدیہ -

ڈرو اس دن کے عذاب سے - کہ اس دن حق نہ چھڑائیگا اور چھڑا نہ سکے گا، کوئی مومن کافر سے کچھ بدلے میں یا کوئی کفایت نہ کرے گا عذاب سے کچھ - اور قبول نہ ہوگی کافر سے درخواست اس مطلب کی - کہ کوئی شفاعت کرے - اور لیا نہ جائے گا کافر سے فدیہ -

تو کیا مومن کے لئے یہ سب کچھ ہو جائے گا ؟ اچھی عدالت ہے ! دوزخ کی آگ کا ذکر تو اُوپر ہو ہی چکا ہے - اِس میں اور کیا ہوگا ؟ فرمایا ہے -

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ٥ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ٥ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ٥ (سورہ واقعہ - آیات ۵۱ تا ۵۵)

پھر وہ تم جو گمراہ ہو اور جھوٹا کہتے ہو - تحقیق کھاؤ درخت تھوہڑ سے - بھرو اس سے پیٹ - پس پیو اس پر گرم پانی - اور پیو پینا پیاسے اُونٹ کا -

دوزخ کو آگ کی جگہ کہا ہے - اس میں تھوہڑ ٹھیر سکیگی سہی ؟ جل نہ جائیگی ؟ پانی تو گرم ہو ہی جائیگا -

سورہ فجر میں دوزخ کے لائے جانے کا ذکر ہے - یہ اقتباس کسی گذشتہ باب میں دیا جا چکا ہے -

وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ (فجر - ۲۲)

اور لایا جائے گا اس دن جہنم ۔

بہرحال کسی محدود چیز کا نام ہے۔ اس آیت پر تفسیر حسینی کا حاشیہ بھی پیچھے تحریر کیا جا چکا ہے۔ اسے یہاں دوہرانا غیر موزوں نہ ہو گا۔

خبر است ہفتاد ہزار زمام باشد مر دوزخ را۔ و ہفتاد ہزار فرشتہ بر ہر زمامے جمع شدہ مے کشند۔ و دوزخ از خشم کافراں مے جوشد و مے خروشد۔

روایت ہے۔ کہ دوزخ کی ستر ہزار باگیں ہیں۔ اور ستر ہزار فرشتہ ہر باگ پر جمع ہو کر اسے کھینچتے ہیں۔ اور دوزخ کافروں سے غصّے سے جوش میں آتا اور شور مچاتا ہے۔

کوئی جانور ہے کیا ؟

پیشانی گھسیٹے جانے کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ کہا ہے۔

لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ (علق - ۱۵)

گھسیٹیں گے ہم پیشانی ۔

اللہ میاں خود پیشانی گھسیٹیں۔ یہ تو سعادت ہے۔ کوئی پرہیزگار بھی اس سے چوں نہ کریگا۔ مگر پھر فرشتے کس کام آئیں گے ؟ ایک اور جگہ کہا ہے۔

خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ○ (دخان - ۴۷-۴۸)

پکڑو اس کو ۔ پس گھسیٹو اس کو بیچوں بیچ دوزخ کے ۔ پھر ڈالو اس کے سر پر عذاب گرم پانی کا ۔

اس حکم کا مخاطب کوئی شخص مذکور نہیں ۔ دوزخ کے عذاب کا بیان

کرتے کرتے یکلخت یہ حکیمہ عبارت آ گئی ہے۔ غالباً یہ حکم فرشتوں کو کیا جانا ہوگا۔ اور فرطِ قہر میں اللہ میاں خود گھسیٹنے لگنے ہونگے۔ کسی مغلوب الغضب افسر کا سا کلام معلوم ہوتا ہے۔ جو چپڑاسی کے آنے کی انتظار نہیں کر سکتا۔ اور خود اپنے ہاتھوں سے موردِ عتاب ملزم پر ہنٹر برسانے لگتا ہے۔ ذرا شان کم ہوتی ہے۔ اگرچہ ملزم کے بھاگ جاگ اٹھتے ہیں۔

کہا تو تھا۔ کہ ہم ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتے۔ لیکن میعاد دوزخ کی بھی وُہی مقرر ہے۔ جو جنت کی۔ فرمایا ہے۔

اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ فِيْهَا (بقر۔ ع ۳۴)

اہل دوزخ۔ وہ ہمیشہ رہتے ہیں اس میں۔

کوئی ساری عمر گناہ ہی کرتا جائے۔ تو بھی گناہ کی مقدار محدود رہیگی سزا اگر اتنی ہی نہیں۔ اس سے دُگنی بھی دی جائے۔ جیسے قیامت کے بیان میں کہہ چکے ہیں۔ تو بھی اس کے لئے ہمیشہ کی آگ میں جھونک دینا۔ گھسیٹتے جانا۔ تھوہر سے پیٹ بھروا بھروا کر گرم پانی پلاتے۔ اور دوزخی پر لونڈھاتے جانا کیا انصاف ہے؟ ہاں یہ اور بات ہے۔ کہ آگ کو مدھم کر دیا جائے۔ آنچ اتنی رہ جائے۔ کہ بے انتہا زمانے میں جرم کی گرمی کے برابر یا اس سے دوچند ہو سکے۔ پانی اور تھوہر کا حساب بھی وہی ہو اور گھسیٹنے میں زور اتنا ہی خرچ کیا جائے کہ ابد تک ایک ہی دفعہ گھسیٹا جا سکے۔ رحمانی عنایت سے کچھ بعید تو نہیں۔ یہ سزا کیا ہوگی؟ اُلٹا پیار ہو جائیگا۔ اللہ میاں کے ہاتھوں یہ نازوں بھری سزا ملے۔ ہم بہشت میں ہوں۔ تو بھی ہمارے تو منہ میں پانی بھر آئے۔ کہ کاش دوزخ میں ہوتے۔ جبھی تو کہا ہے ؎

ہاں ستمگر تجھے کہنے میں مزا آتا ہے لطف میں لطف ستم سا ترے پاؤں تو کہوں

جہاد

جہاد کے مسئلہ نے اسلام کو تلوار کا مذہب بنا دیا ہے۔ اسلامی روایات کے مطابق اہل اسلام کے لئے۔ اگر ان میں طاقت ہو۔ غیر مسلموں پر حملہ کرنا۔ ان سے لڑنا۔ اور انہیں مار ڈالنا۔ یا اگر وہ جزیہ دینا قبول کریں۔ تو ذمی بنا لینا فرضِ مذہبی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن میں یہ ہدایت ہے۔ کہ

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ (بقر - ۱۸۷)

اور لڑو راستے میں اللہ کے ان سے جو تم سے لڑتے ہیں۔

لیکن تفسیر حسینی میں لکھا ہے۔ کہ

ایں حکم بآیت سیف منسوخ است

یہ حکم آیت سیف سے منسوخ ہے۔

موضح القرآن کا حاشیہ اس آیت پر یہ ہے۔

یہ جو فرمایا کہ جو تم سے لڑے اُن سے لڑو۔ اور زیادتی نہ کرو۔ اس کے معنی یہ کہ لڑائی میں لڑکے اور عورتیں اور بُڈھے قصداً نہ مارے۔ لڑنے والوں کو مارے۔

جلالین میں کہا ہے۔

یہ آیت اگلی آیت سے منسوخ ہو گئی۔

مطلب یہ کہ لڑنے کا حکم فقط اپنی حفاظت میں نہیں۔ بلکہ جارحانہ جنگ

وجدال کرنے کا فرمان ہے۔

قرآن میں تو ایک جگہ یہ بھی آیا ہے۔

افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (یونس۔ آیت ۹۹)

(اے محمد!) کیا تو جبر کریگا، لوگوں پر حتی کہ وہ مسلمان ہو جائیں

یہ صاف اکراہ کی ممانعت ہے۔ لیکن اس پر بھی مفسرین نے لکھ رکھا ہے۔ کہ اس ممانعت کو آیت سیف نے منسوخ کر دیا۔ ناظر کو یہ آیت پڑھ کر یہ خیال بھی ہوگا۔ کہ اللہ میاں کو یہ حکم دینے کی ضرورت کیوں پڑی؟ کیوں حضرت محمد سے استفہام کیا؟ کیا حضرت محمد کی خواہش جبر کرنے کی تھی؟ وہ خواہش کس کے حکم سے پیدا ہوئی؟ اور کیا یہ ممکن نہیں۔ کہ آخر محبوب الٰہی نے اپنی خواہش اللہ میاں سے منوا ہی لی ہو؟ مفسرین کا خیال ہے۔ کہ ممانعت جہاں بھی ہوئی۔ موقعہ موافق نہ ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اللہ میاں انتظار کر رہے تھے۔ جب حالات جبر کے لئے موافق ہوئے۔ تو وہ حکم بھی نافذ فرما دیا۔ اور اب ان سب احکام کے معنے یہی لئے جاتے ہیں۔ کہ بے دریغ پیش دستی کرو۔ چنانچہ ہدایا جو سنی مسلمانوں کی مستند شریعت ہے۔ اس میں جہاد کے باب کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوا ہے۔

وقتال الکفار واجب وان لم یبتدؤا بہ

اور جنگ کرنا کافروں سے واجب ہے۔ اگرچہ وہ اس کی ابتدا نہ کریں

سر عبدالرحیم نے جو بنگال ہائی کورٹ کے جج رہے ہیں۔ ایک کتاب لکھی ہے۔ مسلم جورسپروڈنس۔ یعنی اسلامی فقہ۔ اسے عدالتوں میں بھی شرع اسلام پر مستند کتاب مانا جاتا ہے۔ اس میں کہا ہے۔

کفار مکہ نے جو سلوک حضرت رسول سے کیا تھا۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ اسلام کو ہر وقت غیر مسلموں کی دشمنی اور تعصبات سے مزاحمت اور خطرات کا اندیشہ ہے۔ اس لئے اسلام کی سلامتی کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامی سلطنت بشرطیکہ اس میں ایسا کرنے کی استعداد ہو۔ کسی غیر یا مخالف غیر مسلم سلطنت کے برخلاف جنگ کا اعلان کر سکتی ہے۔ (صفحہ ۳۹۳)

قرآن میں فرمایا ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ج وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ

(آل عمران - ۲۵)

مسلمانوں کو چاہئے۔ کہ کافروں کو دوست نہ بنائیں۔ سوائے مسلمانوں کے۔ جو کوئی یہ نہ کرے۔ پس وہ اللہ کی طرف سے نہیں کسی چیز میں۔ سوائے اس کے کہ ڈرو تم ان سے بطور تقیہ کے۔

اس پر جلالین کا حاشیہ یہ ہے۔

اگر بوجہ کسی خوف کے ازراہ تقیہ زبان سے اقرار دوستی کا کر لیا جائے اور دل میں اس کے بغض اور دشمنی رہے۔ تو اس کا کچھ حرج نہیں۔ .. .. جس جگہ اسلام نے پوری قوت نہیں پکڑی۔ وہاں اب بھی یہ حکم باقی ہے .. .. کافر کی دوستی موجب غضب و قہر الٰہی ہے۔

جہاں دشمنی فرض ہو جائے۔ دوستی جائز بھی ہو تو فریب کے طور پر۔ وہاں انصاف اور محبت کا کام ہی کیا ہے؟ نیک اور بد سبھی مذہبوں میں ہیں۔ غیر مسلم نیک ہو تو بھی اس کے خلاف رہو۔ یہ کہاں کا اخلاق ہے؟

یہی بات سورہ نسا میں دوہرائی ہے -

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ

(سورہ نسا - آیت ۱۳۹)

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو - مت اختیار کرو کافروں کو دوست سوائے مسلمانوں کے -

آج کل کی سیاسی مشکلات کا بیج اس آیت میں صاف مل جاتا ہے۔ ہر کافر کی جگہ دوزخ مقرر کرنے کے بعد ایسی ہدایات قدرتی ہیں جن لوگوں کو اللہ تعالے نے بنایا ہی دوزخ کا ایندھن بنانے کے لئے ہے۔ ان سے دوستی کا تعلق کیونکر اختیار کیا جا سکتا ہے؟ وہ تو ملعون ہیں - ان کی زندگی ہو یا موت - برابر ہے - ان کے جینے کا مول کیا؟ فرمایا ہے -

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ (بقر - آیت ۱۹۱)

اور مار ڈالو ان کو جہاں پاؤ اُن کو اور نکال دو ان کو جہاں سے نکال دیا تم کو - اور کفر سخت بُرا ہے قتل سے (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

یہ آیت " وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ " کے بعد آتی ہے - اس میں کہا تھا۔ جو لڑیں اُن سے لڑو - لیکن جلالین فرماتے ہیں

یہ آیت اگلی آیت سے منسوخ ہو گئی -

اب اگلی آیت وہی ہے - جس کا ترجمہ ہم نے اوپر کیا ہے - اس پر جلالین کا حاشیہ یہ ہے -

اور مارو ان کو جہاں پاؤ - اور نکالو ان کو مکہ سے جیسا انہوں نے تم کو

نکالا - (چنانچہ فتح مکہ کے سال انہیں نکال دیا) - اور حرم میں حالت احرام میں لڑنے سے - جس کو تم برا سمجھتے ہو - شرک کرنا زیادہ برا ہے -

سورہ انفال میں کہا ہے -

وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ ۝

(سورہ انفال - آیت ۳۸)

اور لڑو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ یعنی غلبہ کفار کا - اور ہووے دین تمام واسطے اللہ کے - (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

جلالین کا حاشیہ یہ ہے -

اور کافروں کو قتل کرو - یہاں تک کہ شرک اور کفر کا نام و نشان باقی نہ رہے - اور تمام دین اللہ واحدہٗ لاشریک کا ہو جاوے - کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ ہو -

آگے فرمایا ہے -

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ج (انفال - آیت)

اے پیغمبر مسلمانوں کو (کافروں سے) لڑنے پر آمادہ کرو - اگر تم میں بیس آدمی صبر والے (اور مقابلہ پر) جمنے والے ہونگے - تو ان میں سے دو سو پر غالب آئیں گے - (حاشیہ جلالین)

سورہ توبہ میں ہے کہ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَۃً ؕ (سورہ توبہ - آیت ۱۱۹)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو - لڑو ان لوگوں سے جو پاس تمہارے
ہیں کافروں میں سے - اور چاہئے پاویں بیچ تمہارے سختی -
یعنی سب سے پہلے ان کافروں سے لڑو - جو تم سے ملے ہوئے ہیں
پھر اُن سے جو ان سے نزدیک ہیں - اسی طرح درجہ بدرجہ سب کفار
سے مقابلہ کرو - (حاشیہ جلالین)

سُورہ فرقان میں ہے -
فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (فرقان - ۲۳)
اور مت کہا مان کافروں کا اور جہاد کر جہاد بڑا -
تفسیر حسینی میں جہاد کی تعریف کی ہے -
یا بہ قرآن یا بہ اسلام یا بہ شمشیر یا بہ ترک طاعت ایشاں -
سورہ تحریم میں کہا ہے -
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ
اے پیغمبر کافروں سے جہاد کر (ساتھ تلوار کے) اور منافقوں سے
جہاد کر (ساتھ زبان کے) اور (ان پر حجّت قائم کرنے کی - اور) ان
پر سختی کر ساتھ جھڑکنے اور غصّہ کرنے کے -
سورہ صف میں آیا ہے
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا (صف - ۴)
تحقیق اللہ دوست رکھتا ہے اُن کو جو لڑتے ہیں اُس کی راہ میں صف
باندھ کر -
سورہ آل عمران میں ہے -
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا (عمران - ۱۷۸)

اے ایمان والو! صبر کرو۔ باہم مضبوطی اور استقلال رکھو۔ اور لڑائی میں لگے رہو۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

ہم اوپر ظاہر کر چکے ہیں۔ کہ مسلمان فقیہوں کے نزدیک لڑائی مدافعتہً ہی فرض نہیں۔ بلکہ اگر طاقت ہو تو پیشدستی کا حکم بھی ہے۔ تمامتر لڑائی کا روک دینا تو مشکل ہے۔ ظلم کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ مگر اسلامی شرع میں اس حد کو تسلیم نہیں کیا۔ اس حد کے ساتھ بھی جنگ کا طریق ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ بے ضرورت سختی عمل میں نہ آئے۔ قتل بھی کرنا پڑے۔ تو وہ وحشیانہ ڈھنگ سے نہ ہو۔ مگر قرآن میں تو فرمایا ہے

سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ کُلَّ بَنَانٍ ۝ (انفال۔ آیت ۹)

میں ڈالوں گا دلوں میں کافروں کے رعب۔ پس مارو ان کو گردنوں پر اور کاٹو ان کے پور پور۔

گردنیں تو مدافعت میں کاٹی ہونگی۔ اب انگلیوں کی پور پور کاٹنے میں کیسی مدافعت ہوتی؟ یہ ظلم اور انتقام کی انتہا ہے۔ سورہ محمد میں فرمایا ہے۔

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ (سورہ محمد۔ آیت ۴)

پس جب تم ملاقات کرو ان لوگوں کی کہ کافر ہوئے۔ پس مارو گردنیں ان کی یہاں تک کہ جب چور کر دو ان کو (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤی اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ

يَّصَّدَّقُوْا ط فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ .. ـ ـ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ (سورہ نسار آیات ۹۲ تا ۹۳)

اور مسلمان کو مسلمان کا مارنا واجب نہیں ۔ مگر انجانے سے ۔ پس آزاد کرنا ہے ایک مسلمان کا اور خوں بہا پہنچانا اس کے گھروالوں کو ۔ مگر یہ کہ خیرات کردیویں ۔ پس اگر ہووے اس قوم سے کہ دشمن ہیں تمہارے .. .. .. اور جو کوئی مسلمان جان کر مار ڈالے ۔ پس اس کی جزا ہے دوزخ ۔ ہمیشہ اس میں رہیگا ۔ اور غصہ اللہ کا اوپر اس کے اور لعنت ہے

ان آیات نے جہاد کی حقیقت اور صاف کردی ۔ اگر جہاد مدافعتی لڑائی ہو اور انتقاماً مقابل کی قوم کا قتل کیا جارہا ہو ۔ تو اس قوم میں چاہے کوئی مسلمان ہو چاہے غیر مسلمان برابر واجب قتل ہوگا ۔ مگر نہیں ۔ غیر مسلم کا قتل جان کر کرنا بھی فرض ہے ۔ اور مسلمان کا قتل بھولے سے ہو جائے ۔ تو اس کا بھی خوں بہا اور کفارہ ۔ اس سے زیادہ طرفداری اور کیا ہو سکتی ہے ؟ اور اگر کوئی خوں بہا اور کفارہ نہ دے ۔ تو اس کی سزا کیا ؟ وہی دوزخ ؟

اس طرح کے قتل و خون میں اپنی طرف کی جانیں بھی تلف ہونگی ۔ اور روپیہ بھی خرچ آئیگا ۔ اس کا انتظام مندرجہ ذیل آیات سے کیا ہے ۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْيَاءٌ (بقر ۱۴۹)

اور مت کہو جو لوگ مارے جاتے ہیں راستے میں خدا کے کہ مر گئے ۔ بلکہ وے زندہ ہیں ۔

جلالین کے حاشیہ میں لکھا ہے

سبز جانوروں کی پوٹوں میں ہیں ۔ اور جنت میں پھرتے ہیں ۔

اگر مذہب کی اشاعت جبراً نہ کرنی ہو۔ تو خواہ مخواہ کا کشت و خون کیوں ہو؟ اور کیوں مرے ہوؤں کو خواہ مخواہ زندہ کہیں اور بہشت میں جانور بنائیں؟

سورہ توبہ میں آیا ہے۔

لٰکِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَیْرَاتُ (توبہ - آیت ۸۴)

لیکن رسول اور جو لوگ ایمان لائے ساتھ اس کے۔ جہاد کیا انہوں نے ساتھ مالوں اپنے کے اور جانوں اپنی کے۔ اور واسطے انہیں کے ہیں بھلائیاں۔

پھر فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ

(سورہ توبہ - آیت ۱۱۰)

تحقیق اللہ نے مول لی ہیں مسلمانوں سے جانیں ان کی اور مال ان کے اس قیمت پر کہ ان کے لئے بہشت ہیں۔ لڑیں گے بیچ راہ اللہ کے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّیْهِمْ بِهَا (توبہ - ۱۰۲)

لے ان کے مال میں سے خیرات کہ پاک کرے تو ان کو (یعنی ظاہر میں) اور پاکیزہ کرے تو ان کو ساتھ اس کے (یعنی باطن میں)

اب اگر مسلمانوں کو فقط اپنی جان اور مال مذہب پر نثار کر دینے کا حکم ہو تو پھر بھی خیر ہے۔ کیونکہ بغیر غیر مسلموں کے ساتھ لڑے بھی یہ دونو اجناس مذہب کی بھینٹ کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً طاعون زدوں کی خدمت کریں۔

مصیبت زدوں کی امداد میں جان جوکھوں میں ڈالیں۔ مگر اسلام کی تاریخ میں اس طرح جان و مال نذر کرنے کی مثالیں نہ ملیں گی۔ یہ جانیں اور یہ مال کیونکر اسلام پر تصدّق ہونگے؟ فرمایا ہے۔

وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَنْ يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِنْ عِنْدِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا۔ (توبہ۔آیت ۴۹)

اور ہم منتظر ہیں واسطے تمہارے کہ پہنچاوے اللہ عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں سے

تفسیر حسینی میں آخری فقرے کی توضیح یوں کی ہے۔

از نزدیک خود چوں صیحہ در رجف و خسف تا ہلاک شوید۔ یا برساند بشما عذابے بدستہائے ما کہ شمارا بسبب کفر بقتل رسانیم۔

اپنے پاس سے جیسے عذاب سورج گرہن اور چاند گرہن سے تاکہ ہلاک ہو جاؤ۔ یا تمہیں عذاب پہنچائے ہمارے ہاتھوں تاکہ تمہیں بسبب کفر قتل کریں۔

ان خدائی فوجداروں کو دیکھنا۔ کہ اللہ میاں نے کفر کی سزا کا حکم انہیں دیا ہے۔ کہ کافر کو قتل کردو۔ کیا مخول ہے؟ لڑائی میں یہ مریں تو زندہ ہیں۔ اور جو غیر مسلم مریں۔ تو ان پر عذاب ہوا ہے۔ موت تو بھائی! دونو کی برابر ہے۔ اس کا نام شہادت ہے تو۔ اور عذاب ہے تو۔

یہ تو ہوا جانوں کا مصرف۔ مال کا بھی سن لیجئے۔ فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ (انفال ۲۷)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ مت خیانت کرو اللہ اور رسول کی۔

اس پر موضح القرآن میں لکھا ہے۔

چوری اللہ اور رسول کی یہ ہے۔ کہ چھپ کر کافروں سے ملیں۔ اپنے مال اور اولاد کے بچاؤ کو ۔۔ ۔۔ اور یہ بھی ہے کہ مالِ غنیمت چھپا رکھیں۔ سردار پاس ظاہر نہ کریں۔

اہل اسلام کی جانیں اور مال اللہ میاں کے ملک ہوئے۔ مگر اب قرض بھی چاہتا ہے۔ کہا ہے۔

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ

(سورہ بقر۔ آیت ۲۴۹)

بھلا کون ہے جو قرض دے اللہ کو قرض اچھا۔ پس دوگنا کر دے واسطے اس کے اس کو۔

اس قرض کی توضیح موضح القرآن میں کی ہے۔

جہاد میں خرچ کریں۔

تفسیر حسینی میں لکھا ہے۔

ابوالدحداح انصاری پیش آمد و گفت یا رسول اللہ۔ خدا ایں قرض چرا مے طلبد۔ آنحضرت فرمود۔ کہ مے خواہد کہ تا شما را بواسطہ آں بہ بہشت بہ برد۔ ابوالدحداح گفت یا رسول اللہ۔ مرا دو خرماستان ہستند۔ و بہترین خرماستاں حلیمہ نام دارد۔ اگر آں را بقرض خدا دہم شما ضامن بہشت من مے شوید۔ سید عالم فرمود۔ کہ من ضامن مے شوم۔ کہ حق سبحانہٗ دہ چنداں در ریاض جناں بتو ارزانی دارد۔ گفت اے سید! بشرط آنکہ فرزندانِ من و مادرِ ایشاں با من باشد۔ خواجہ عالم فرمود۔ کہ آری چنیں باشد۔

ابوالدحداح انصاری سامنے آیا۔ اور کہا۔ یا رسول اللہ۔ خدا
یہ قرض کیوں مانگتا ہے۔ آنحضرت نے فرمایا۔ کہ اللہ چاہتا ہے۔ کہ
تمہیں اس کے ذریعے بہشت میں لے جائے۔ ابوالدحداح نے
کہا۔ یا رسول اللہ۔ میرے پاس دو نخلستان ہیں۔ ان میں سے بہتر
کا نام جنیمہ ہے۔ اگر اسے خدا کو قرض دے دوں۔ تو کیا آپ میرے
لئے بہشت کے ضامن ہوتے ہیں؟ سرورِ عالم نے فرمایا۔ کہ میں ضامن
ہوتا ہوں۔ کہ حق سبحانہٗ باغ بہشت میں دس گنا تجھے دیگا۔ کہا
اے پیغمبر! بشرطیکہ میرے لڑکے اور اُن کی ماں میرے ساتھ ہو۔ فرمایا۔
ہاں ایسا ہی ہوگا۔

جہاد کے لئے روپے کی ضرورت ہے۔ سرکار بھی لڑائی کے وقت
قرضہ لیتی ہے۔ اللہ میاں نے بھی لیا۔ تو کیا بُرا کیا؟ سرکار بھی سُود کا وعدہ
دیتی ہے۔ یہاں بھی بہشت میں کئی گنا دیئے جانے کا اقرار ہے۔ اور
صرف دینے والے کو ہی نہیں۔ اس کی اولاد اور اولاد کی ماں کو بھی وہاں
لے جانے کا وعدہ ہے۔ ایک نخلستان کے بدلے میں ایک خاندان
کا خاندان بہشت میں! سخاوت ہے۔ یا ضرورت سُود کا نرخ بڑھا
رہی ہے؟

یہی بات سورہ مائدہ میں پھر فرمائی ہے۔

وَأَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ
وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ (سورہ مائدہ - آیت ۱۱)

اور قرض دو تم اللہ کو اچھا۔ البتہ میں تمہاری بُرائی دُور کردوں گا
اور داخل کروں گا تمہیں بہشتوں میں۔

جہاد میں خرچ کر دیا - اب چاہے گناہ کتنے بھی ہوں - سب دُور - اُوپر جو فرما آئے ہیں - لے مال ان سے خیرات تاکہ پاک اور صاف کرے تو انہیں -

یہ مال کس چیز میں خرچ ہوتا ہے - فرمایا ہے -

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ... وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

(سورہ انفال - آیت ۶۰)

اور تیاری کرو ان کے لئے جو تم کر سکو - قوت سے اور گھوڑوں سے ڈراؤ ان سے دشمن کو اللہ کے اور دشمن کو اپنے ... اور جو تم خرچ کرو گے اللہ کی راہ میں - اللہ تمہیں پورا کر دے گا - اور تم ظلم نہ کئے جاؤ گے -

اسلام کی حکومت کے دنوں اکثر ممالک میں غیر مسلموں کے لئے گھوڑے کی سواری اور اسلحہ کا استعمال منع ہو جاتا رہا ہے - اس کی بنیاد فقیہوں نے اسی آیت کو قرار دیا ہے - کہ اس ساز و سامان کی ضرورت جہاد کے لئے ہے - کفار کے ہاتھ میں یہ ساز و سامان چھوڑنا اصول جہاد کی صاف خلاف ورزی کرنا ہے -

جان اور مال اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا اجر اب تک اُخروی رہا ہے - یعنی دوسری دُنیا کا - ممکن ہے کوئی اس دُور کے وعدے کے بھروسے اتنا ایثار کرنے کو تیار نہ ہو - یہاں کا بھی اجر فرمایا ہے -

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا (فتح - ۳۴)

اور وعدہ کیا ہے تم کو اللہ نے بہت لوٹوں کا۔ کہ لوگے ان کو
وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ
(سورہ انفال۔ آیت ۳۸)

اور جانو تم کہ جو کچھ لوٹ میں لاؤ کسی چیز سے۔ پس واسطے اللہ کے
ہے پانچواں حصہ اس کا اور واسطے رسول کے۔
یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ ط قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا
اللّٰہَ (سورہ انفال۔ آیت ۱)

پوچھتے ہیں تم سے بابت لوٹوں کے۔ کہ لوٹیں ہیں واسطے اللہ کے اور
رسول کے۔ پس ڈرو اللہ سے۔
مطلب یہ کہ اللہ اور رسول کا حصہ دو۔ اور باقی لے جاؤ۔ یہی نہیں
کچھ اور بھی ہے۔ فرمایا ہے۔
اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُمْ (المومنون۔ ع ۱)
اور (وہ عورتیں) جو تمہارے دائیں ہاتھ ان کے مالک ہوں۔
یہ ایک اصطلاح ہے قرآن کی جس کا ترجمہ ہر مفسر نے جنگ میں ہاتھ
آئی ہوئی عورتیں کیا ہے۔ اور وہ بطور لونڈیاں رکھی جا سکتی ہیں۔
غیر مسلم کے لئے فقط قتل ہی کا حکم نہیں۔ اگر جزیہ دے دے۔ تو
اسے رعایا بنا کر رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ کہا ہے
قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ
مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا
الْکِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّہُمْ صٰغِرُوْنَ ٥
(سورہ توبہ آیت ۲۷)

لڑو ان سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور یوم قیامت پر اور جو حرام نہیں کرتے جو حرام کیا اللہ اور اس کے رسول نے اور نہیں پیروی کرتے سچے دین کی۔ ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے۔ حتیٰ کہ وہ مطیع ہوں اور جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے اور وہ ذلیل ہوں۔

جلالین کا حاشیہ اس آیت پر یہ ہے۔

مقاتلہ کرو اور مارو ان لوگوں کو جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان نہیں رکھتے (یعنی رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی منکر ہیں۔ کیونکہ اگر اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ضرور ایمان لاتے) اور جو چیزیں اللہ اور اُس کے پیغمبر نے حرام فرمائیں۔ جیسے شراب پینا اس کو حرام نہیں سمجھتے اور مذہب اسلام اختیار نہیں کرتے۔ جو سچا دین اور سب مذہبوں کو منسوخ کرنے والا ہے۔ یہ لوگ یہودی اور نصرانی ہیں۔ جن کو کتاب آسمانی دی گئی۔ یہ ہرگز مسلمان نہ ہونگے۔ یہاں تک کہ محصول جو اُن پر مقرر ہوگا۔ ہر سال ذلیل ہو کر دیں گے اور تابع حکم اسلام کے بمجبوری ہونگے۔

قرآن میں تو یہ رعایت کہ جزیہ لے کر رعیّت بنالو۔ عیسائیوں۔ اور یہودیوں تک ہی محدود ہے۔ لیکن بعد کے فقیہوں نے اسے تمام غیر مسلموں کے لئے عام کر دیا ہے۔ چنانچہ ہدایا میں لکھا ہے۔

فَاِنْ امتنعو دعوھم الی الجزیۃ فان بذلوھا فلھم ما للمسلمین

اور اگر (اسلام قبول کرنے سے) انکار کریں۔ تو دعوت دیں اُن کو جزیہ کی۔ پس اگر اُنھوں نے قبول کیا۔ تو اُن کے لئے امان ہے۔ جیسے مسلمانوں کے لئے۔

اللہ میاں کا تعصّب

انسانوں میں تعصّب پایا جاتا ہے۔ اور یہ اُن کی کمزوری ہے۔ سچّا دھرم تعصّب سے اُونچا اُٹھنا سکھاتا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس تعلیم میں سب سے زیادہ محرک پرماتما کا تصوّر ہے۔ دھرم کے واعظ کہا کرتے ہیں۔ کہ دیکھو۔ پرماتما گنہگار سے گنہگار انسان کو جینے دیتا ہے۔ اپنی ہستی سے منکروں کو بھی معاً غارت نہیں کر دیتا۔ مثل ہے۔ پاپی کے مارنے کو پاپ بلی ہے۔ بدکردار اپنی بدکرداری سے سب سے زیادہ نقصان اپنا کرتا ہے۔ پرماتما کی عادت یہ نہیں۔ کہ کم ظرف لوگوں کی طرح اپنے مخالفوں پر برس پڑے۔ لیکن اگر کسی مذہب میں پرماتما کو بھی طرفدار۔ حسنِ اعمال کا نہیں۔ خاص اقوام کا۔ ظاہر کیا گیا ہو۔ تو اس مذہب کے مقلدوں کے تعصّب کے مرض کو لاعلاج سمجھنا چاہئے۔ یا تو اُنہیں پرماتما کا تصور بدلنا ہوگا۔ یا وہ جب تک اس مذہب کے پابند ہیں۔ ضرور تنگ دل اور متعصب رہیں گے۔ قرآن شریف میں بیان کیا اللہ میاں کمزور انسانوں کی اس کمزوری سے اُوپر نہیں اُٹھ سکا۔ فرمایا ہے

ان اللہ جامع المنافقین والکافرین فی جہنّم جمیعا

(سورہ نساء۔ آیت ۱۳۸)

تحقیق اللہ جمع کرنے والا ہے منافقوں اور کافروں سب کا جہنم میں

جہنم کی کیفیت کا ذکر ہم اُوپر کر چکے ہیں۔ اللہ میاں کے انصاف میں ایک
بڑا نقص یہ ہے۔ کہ مختلف گناہوں میں فرق نہیں کرتا۔ گنہگاروں کی
گنہگاری میں درجوں کا بے انداز فرق ہوتا ہے۔ ان کی تعزیر میں بھی اتنے
ہی بے انداز فرق ہونے چاہئیں۔ مگر سب کے لئے آگ۔ گرم پانی۔
ٹھوہڑ۔ اور اسی قسم کی دیگر یکساں سزائیں مقرر ہیں۔ ممکن ہے۔ کسی
کسی کو ٹھوہڑ معاف ہو جاتے۔ یا گرم پانی نہ پلایا جائے۔ مگر پھر میعاد بے
انتہا ہے۔ محدود جرم کے لئے ابدی قید! یہ بھی ہؤا۔ اب کہتے ہیں سب
کافر یعنی غیر مسلم۔ اور منافق۔ یعنی جنہوں نے جھوٹ موٹ کا اسلام
اختیار کر لیا ہے۔ مگر دل سے مسلم نہیں۔ سب دوزخ میں جائیں گے۔
یہ تو شاید کوئی کٹر سے کٹر مسلمان بھی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کہ غیر مسلم اخلاقاً
یا رُوحانی طور پر اچھے ہوتے ہی نہیں۔ انہیں دوزخ میں بٹھانے کے
کیا معنے؟ اوّل تو اہلِ اسلام کا مسلمہ ہے کہ جو ہوتا ہے۔ وہ پہلے
سے مقدر ہے۔ کافر اپنی مرضی سے کافر تھوڑا ہیں۔ لوحِ محفوظ کی تحریر
نے انہیں کافر مقرر کیا ہے۔ اس میں ان کا قصور کیا؟ اللہ نے جیسا
بنا دیا۔ بن گئے۔ یہ اللہ میاں کی زبردستی ہے۔ کہ اپنی مخلوق میں
سے کسی کو جنت میں جانے کے لئے اور کسی کو دوزخ میں جانے
کے لئے منتخب کر لے۔ اور اسی غرض سے انہیں بالترتیب مسلم
اور کافر بنا دے۔ چلو پھر قاعدے کا ٹھاٹھ کیا تو ہے۔ کہ بد اعمال دوزخی
ہونگے اور خوش خصال بہشتی ہونگے۔ اگر اللہ یہ بھی کر دیتا۔ کہ خوش
خصالی کو بھی مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیتا۔ اور بد اعمالی کا ٹھیکہ غیر مسلموں
کو دے دیتا۔ تو انہیں بالترتیب بہشت اور دوزخ کا وارث کرنے میں

حق بجانب رہتا۔ لیکن اب تو یہ بھی نہیں۔ بُرے مسلم بھی ہیں۔ اچھے غیر مسلم بھی۔ تو ان کی سزا جزا میں بے وجہ تمیز کورا تعصب ہے۔ یہی بات سورہ بنی اسرائیل میں آئی ہے۔

وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل - ۷)

اور بنایا ہم نے جہنم واسطے کافروں کے قید خانہ

چلو مانا مُسلمان اللہ میاں کے خاص بندے سہی۔ غیر مسلم بھی بندے تو اسی کے ہیں۔ ان غریبوں کو پورا بہشت نہ سہی۔ ان کے نیک اعمال کا (آخر یہ تو کوئی شخص بغیر روز کے مشاہدے کو جواب دیئے کہہ نہیں سکتا۔ کہ غیر مسلموں میں خوش اخلاقی کا عدم ہے) کچھ تو میٹھا ثمر دیتا۔ اور اگر موجودہ دُنیا عقبیٰ کا پیش خیمہ ہے۔ تو یہاں تو اللہ نے اپنی نعمتیں مسلمانوں کے لئے خاص کیں نہیں۔ آگے الٰہی صفات کی تاریخ میں نئے باب کا افتتاح ہو تو اور بات ہے۔

سورہ آل عمران ع ۱۴ میں مسلمانوں کو کہا ہے۔

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ۝

بلکہ اللہ تمہارا کارساز ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

اس سے کسی کو کیا حسد ہے؟ مسلمانوں کا کام بنا دیا کرے۔ مگر فقط انہیں کا نہ بنائے۔ اعتراض تو اس رکوع میں آئی اس عبارت پر ہے جس سے مسلمانوں کا کارساز ہونا طرفداری کی علامت بن جاتا ہے۔

۔یَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ - ع ۲-

کافروں کا مٹانے والا

اتنی ہی تسلّی ہے۔ کہ ظالم کا کاروبار اس قرآنی آیت کے تحت

میں نہیں چل رہا - کام سب کے بن اور بگڑ رہے ہیں - اس میں تخصیص مذہبی نہیں - سورہ انفال میں اور زیادہ سختی سے کام لیا ہے۔

وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (انفال - آیت ۷)

اور کاٹے جڑ کافروں کی۔

جڑ کٹ جائے - تو دوزخ کی ضرورت کیا؟ اور دوزخ ہمیشہ رہنا ہے تو یہ جڑ کیونکر کٹیگی؟ سورہ بقر میں آیا ہے۔

فلعنۃ اللہ علی الکافرین (سورہ بقر - ۷۹)

پس لعنت ہے اللہ کی کافروں پر۔

اس کھو کھلی پھٹکار سے کیا حاصل؟ جب حضرت اقبال ہی فرماتے ہیں۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
بجلیاں گرتی ہیں بیچارے مسلمانوں پر

کیا غضب ہے کہ ہیں اغیار کے گھر حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

سورہ احزاب میں مسلمان مردوں اور عورتوں کو بے وجہ ایذا دینے سے منع کیا ہے - فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۔۔ لَنُغْرِيَنَّكَ ۔۔ ۔۔ مَلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۝

(سورہ احزاب - ۶۲)

اور جو ایذا دیتے ہیں مسلمان مردوں اور عورتوں کو بغیر اس کے کہ
انہوں نے کیا ہو گناہ - پس تحقیق اُٹھایا انہوں نے بڑا بہتان اور
گناہ ... ہم پیچھے لگا دینگے تجھ کو ان کے - وہ لعنت کئے گئے -
جہاں پائے جائیں - پکڑے جائیں - اور قتل کئے جائیں قتل -
مسلمانوں کو بے وجہ تکلیف دینے سے اللہ میاں کو ناراض ہونا
ہی چاہیئے - مگر کیا نا مسلمانوں کو بیوجہ ایذا دینے کی بھی کوئی سزا قرآن
کریم میں بیان فرمائی ہے ؟ اور اگر یہیں مومنوں اور مومنات کی جگہ عام
انسان کہہ دیا ہوتا - تو کیا ہرج تھا ؟ یہ تو ہوئی ایذا کی بات - قتل
کے متعلق بھی یہی تمیز برتی ہے - پھر دعوٰی یہ ہے - کہ عالمگیر تعلیم ہے -
صاف کہا ہے - اللہ میاں کو کافروں سے بیر ہے -

اَللّٰہُ عَدُوٌّ لِّلْکٰفِرِیْنَ (البقر - ۹۸)

اللہ دشمن ہے کافروں کا -
اس تخصیص کی وجہ کیا ؟ وجہ فقط یہ کہ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران - ۱۶)

تحقیق دین اللہ کی طرف سے ہے اسلام
اس پر جلالین نے لکھا ہے -
اس کے سوا اللہ کے نزدیک کوئی دین مقبول نہیں -
اوپر تو کہا تھا - موسٰی کو کتاب دی - عیسٰی کو کتاب دی - سب اقوام
کو پیغمبر بھیجے - قرآن اس قوم میں اُتارا - جس میں پہلے ڈرانے والا نہ آیا
تھا - اب سوائے اسلام کے اور مذہب ہی الٰہی نہ رہے ؟ حضرت
محمد کی دعوت سے پیشتر کے لوگوں کا کیا بنا ؟ اور جو حضرت کی دعوت

کے وقت بھی کسی اور ملک میں پیدا ہونے کی وجہ سے حضرت کے پیغام کو جاننے سے محروم رہے ۔ ان کے لئے الٰہی مذہب سے مستفیض ہونے کا کیا موقعہ ہے ؟

سورہ اعراف میں فرمایا ہے ۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

تحقیق یہ لوگ ، باطل ہے دین جس میں کہ ہیں ۔ اور باطل ہے جو کچھ تھے کرتے ۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

کسی سارے مذہب کو جھوٹا قرار دینا حقیقت سے بعید ہوتا ہے ۔ بہرحال مذہب تو شروع سے قرآن کی اپنی شہادت کے مطابق اللہ میاں کا ہی الہام کیا ہوا چلا آتا ہے ۔ لوگوں نے اس میں تصرف کر لیا سہی ۔ اگرچہ اس میں خود مسلمان مولاناؤں کو اختلاف ہے ۔ بعض علمائے اسلام کا خیال ہے ۔ کہ اللہ کے وحی کئے مذہب میں انسان معنوی تحریف کرلے ۔ تو کرلے ۔ لفظی تحریف نہیں کر سکتا ۔ لیکن خیر ۔ مان لو ۔ کسی قسم کی تحریف بدعتی لوگوں نے کر لی ۔ تو کیا وہ سارے کا سارا مذہب جھوٹا ہو جائیگا ۔ خود اہل اسلام کے مختلف فرقوں میں عقائد اور رسوم کا اختلاف ہے ۔ کیا اس اختلاف کی وجہ سے اس قول کے ماتحت اسلام جھوٹا مذہب نہ کہلائیگا ؟ سوامی دیانند کے یہ لفظ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہیں ۔ کہ

کسی مذہب میں سب لوگ برے اور بھلے نہیں ہو سکتے ۔ یہ یک طرفہ ڈگری دینا بڑی بھاری جہالت ہے ۔

اور اگر یہ سچائی تسلیم کر لی جائے ۔ کہ ہر مذہب میں سچائی بھی ہے ۔

اور اس کے ساتھ بطلان کا شائبہ بھی مل گیا ہے - تو اس سے جہاں مذاہب کی جنگ ختم ہو جاتی ہے - وہاں یہ غلط اور بعید از حقیقت خیال بھی بے بنیاد ہو جاتا ہے - کہ اللہ کی طرف سے فقط ایک خاص مذہب ہے - اور دُوسرے سراسر القائے شیطانی ہیں - اور کسی خاص مذہب کے پیرؤں کے لئے بہشت مختص ہے - اور دوسروں کے لئے دوزخ تیار کر رکھا ہے - رشی دیانند کا یہ قول بھی اتنا ہی صفحۂ دل پر نقش کرنے کا مستحق ہے جتنا مندرجہ بالا اقتباس -

جو دھارمک ہیں - وہ سُکھ اور جو پاپی ہیں - وہ سب متوں میں دُکھ پائیں گے -

تمام مذاہب کی سچائی پرماتما کا الہام ہے - اور اس میں اغلاط کا شائبہ انسانی دستبرد - اِس دستبرد کے خلاف آواز اُٹھاؤ - اور قدیم الہام کی اشاعت کرو +

شرک

اہل اسلام کا دعویٰ ہے۔ کہ ان کا مذہب بالخصوص توحیدی مذہب ہے۔ یعنی اس میں پرماتما کی وحدت پر بڑا زور دیا ہے۔ اہل اسلام کی نظر میں سب سے بڑا گناہ ہی شرک ہے۔ شرعی مولاناؤں کی رائے میں اور سب گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ لیکن شرک اللہ میاں سے بغاوت ہے اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں قرآن میں اللہ میاں کو صاف تمام برائیوں کا عفو کرنے والا۔ تائب الذنوب جمیعا کہا ہے۔ وہاں مفسروں نے لکھ دیا ہے۔ بغیر شرک کے۔ ہم یہاں اس فلسفی بحث میں نہ پڑیں گے۔ کہ کیا واقعی شرک اور گناہوں سے قبیح تر گناہ ہے؟ اگر شرک کے منطقیانہ نتائج پر غور کریں۔ اور دیکھیں۔ کہ ایک پرماتما کی جگہ متعدد مالک مان لینے سے کیا کیا برائیاں انسان کر سکتا ہے۔ تب تو شاید شرک کا جرم نہایت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انسان جیسی اس کی طبیعت اس وقت پائی جاتی ہے اپنے تمام عقائد سے منطقی طور پر اخذ ہونے والے اخلاقی قبوحات کا مرتکب ہوتا نہیں۔ اور جہاں تک عقیدہ شرک کا فلسفے سے تعلق ہے۔ یہ عقیدہ غلط ضرور ہے۔ لیکن ایسا نہیں۔ کہ اس کے معتقد کو قتل ہی کر دیا جائے۔ سزا تو فقط اخلاقی جرائم کی دی جا سکتی ہے۔ اگر وہ جرائم عمل کی صورت اختیار کر لیں۔ تو انسانی عدالت سے بھی ان پر تعزیر ہو گی۔ اور الٰہی عدالت سے بھی۔ اور اگر وہ فقط ذہنی تصور تک ہی محدود رہیں۔

تو پرماتما اُن کی سزا دیگا۔ انسان کی رسائی لوگوں کے تصورات تک نہیں۔ اعتقادیات کے متعلق وعظ و نصائح۔ تحاریر و تقاریر کو اصلاح کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں عملاً گردن زدنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اعتقادیات کا رُوحانی کوائف پر بالواسطہ اثر ہوتا ہے۔ اِس میں جہاں معبود کی وحدت یا کثرت اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی وہاں معبود کی متصورہ صفات اس سے بھی کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہیں۔ پرماتما کے تصور میں رحم اور انصاف۔ علم اور علم جیسے اوصاف کا تصور شامل ہو۔ تو انسان ان رنگوں میں رنگا جاتا ہے۔ اور اگر ایک معبود بھی متعصب۔ قاہر۔ متلون مزاج۔ بے ضابطہ۔ اپنے آپے سے باہر ہو جانے والا ہو۔ تو عابد پر شہوانی جذبات سوار رہتے ہیں۔

اہل اسلام نے وحدانیت کو جس قدر اہمیت دی ہے۔ آریہ سماج اس بارے میں ان کے ساتھ ہمنوا ہے۔ اس قید کے ساتھ کہ شرک مجلسی جرم نہیں۔ اور قانوناً اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہونا چاہئے اور اس ایزاد کے ساتھ کہ شرک کے برابر معبود کے اوصاف پر بھی نظر ہونی چاہئے۔ اگر اہل اسلام اس نظر سے اپنے معبود کے تصور کی پڑتال فرمائیں۔ تو ممکن ہے۔ اپنے آپ کو مشرکوں سے کم خطا دار نہ پائیں۔

اس باب میں ہمیں دیکھنا یہ ہے۔ کہ کہیں خود قرآن شریف میں تو شرک کی تعلیم نہیں دی گئی؟ خود اہل اسلام تو آریہ سماجیوں کو بھی مشرک کہنے سے نہیں چوکتے۔ اور یہ الزام وہ ہمیں فقط اس لئے دیتے ہیں۔ کہ ہم موجود محض پرماتما کو نہیں۔ روح اور مادے کو بھی مانتے ہیں۔

اگر ماسوائے اللہ کے موجود ماننا شرک ہے۔ تو مسلمان بہت بڑے مشرک ہیں۔ کیونکہ اس وقت ان کی نظر میں بھی اللہ کی ذات کے سوا اور کئی موجود ہیں۔ شیطان ہے۔ انسان ہے۔ اور غیر ذی روح اشیا ہیں۔ ابدیت کی صفت میں ملائکہ۔ شیاطین۔ دوزخی۔ بہشتی وغیرہم سب اللہ میاں کے ساتھی ہیں۔ خالق ہونے میں بھی قرآن شریف اللہ میاں کو "احسن الخالقین" یعنی خالقوں میں بہترین قرار دیتا ہے جس کے معنے یہ ہیں۔ کہ خالق اور بھی ہیں۔ ایسا ان سب موجودوں پر بحیثیت ملائکہ۔ شیاطین۔ اصحاب جہنم و جنت وغیرہ ایمان لانا کفر ہے۔ یا اسلام؟ اس ایمان سے شرک ہوتا ہے یا نہیں؟ قرآن کریم فرماتا ہے۔

وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ (نسا - ۱۳۶)

اور جو انکار کرے اللہ اور فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور یوم قیامت سے۔ پس تحقیق وہ گمراہ ہے۔ بہت گمراہ۔

اہل اسلام کا دعوٰی ہے کہ ہم فقط اللہ پر ایمان لاتے ہیں۔ یہاں ایمان کا مرجع ایک نہیں۔ کئی ایک ہیں۔ ہمارے اور اہل اسلام کے ایمان میں اتنا فرق ضرور ہے۔ کہ ہم ماسوائے خدا کو بھی ازل سے بطور خود موجود مانتے ہیں۔ اور اہل اسلام ازلی موجود فقط اللہ میاں کو اور باقی سب کو اللہ میاں کا بنایا ہوا حادث تصور کرتے ہیں۔ اس سے انہیں تقدیر کا مسئلہ وضع کرنا ہوتا ہے۔ جس سے وہ ذی روح مخلوقات کے افعال۔ صفات۔ حالات کی غیر مساوات کا جواب

دے سکیں ۔ اس کا فلسفی نتیجہ یہ ہوتا ہے ۔ کہ اللہ میاں ہیں اول تو غیر منصف ہونے کا الزام آتا ہے ۔ کہ اس نے محض اپنی مرضی سے ہی اپنے مختلف مخلوقوں کو غیر مساوی بنا دیا ۔ ان کے دُکھ اور سُکھ کی ذمہ داری بھی اس پر پڑتی ہے ۔ اور پھر اُن کے افعال اور عادات کی غیر مساوات کا ذمہ دار بھی اللہ میاں ہی ہو جاتا ہے ۔ اور غیر مدرک اشیا کی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے ۔ کہ مدرک موجود نے عدم ادراک کی صفت کہاں سے پیدا کی ؟ اپنے میں سے یا باہر کہیں سے ؟ اپنے کامل ادراک سے ناقص ادراک کو کیسے پیدا کیا ؟ نُقص کا منبع کون ہے ؟ آریہ سماج کا مسئلہ تثلیث جواہر ازلی اس عقدے کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتا ہے ۔ اہل اسلام کہتے ہیں ۔ ازلیت صفت الٰہی ہے ۔ اس میں غیر اللہ کو شریک نہیں کرنا چاہئے ۔ سوال یہ ہے ۔ کہ کیا ابدیت صفت الٰہی نہیں ؟ اس میں دوسروں کو شریک کیوں کرتے ہو ؟ اس مسئلے پر ہم اپنی کتاب 'جواہر جاوید' میں مفصل بحث کر چکے ہیں ۔ یہاں اتنا ہی تبصرہ کافی ہوگا ۔

ہماری نظر میں توحید کے معنے ہیں طاعت میں پرماتما کا شریک کسی کو نہ کرنا ۔ سب سے بڑی قدرت اسی کی ہے ۔ سب سے بڑا علم اسی کا ہے ۔ سب سے بڑی اخلاقی اور روحانی فضیلت اسی کی ہے ۔ پرماتما کی اس عظمت کے سامنے انسان کا طبعی رحجان ہے کہ جھکے ۔ بڑی قدرت والے کے سامنے چھوٹی قدرت والا جھکتا ہے ۔ بڑے عالم کے سامنے چھوٹا عالم جھکتا ہے ۔ بڑے اخلاق والے کے سامنے ادنےٰ اخلاق والا جھکتا ہے ۔ بڑی روحانیت والے کے سامنے ادنےٰ روحانیت کا شخص جھکتا ہے ۔ یہ بات انسان انسان کے باہمی تعلق میں دیکھی جاتی ہے ۔

پھر پرماتما میں تو ان صفات کا کمال ہے۔ اس کی طاعت فرض اولی ہے۔ اس طاعت کا پھل خود بخود مطیع کو حاصل ہوتا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر اطاعت انسانوں کی بھی کی جاتی ہے لیکن اس اطاعت اور پرماتما کی طاعت کا کوئی مقابلہ نہیں۔ پرماتما کا حکم ماننے۔ پرماتما کے سامنے جھکنے اور انسانوں کا حکم بجا لانے اور انسانوں کے سامنے جھکنے میں کوئی تناسب نہیں۔ شرک اس میں ہے۔ کہ ان طاعتوں کو ایک درجہ دیا جائے۔ مگر قرآن میں تو ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ پرماتما کی طاعت کے ساتھ رسول کی طاعت کا برابر ذکر ہے۔ یہی نہیں۔ ان سے منحرف ہونے کی بھی برابر سزا ہے۔ چنانچہ کہا ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝		(نسا - آیت ۱۲-۱۳)

اور جو طاعت کرے اللہ اور رسول اس کے کی۔ داخل کریگا اس کو بہشتوں میں۔ جن کے نیچے نہریں ہیں۔ اور وہ رہیں ان میں۔ اور یہ کامیابی بڑی ہے۔ اور جو نافرمانی کرے اللہ اور اُس کے رسول کی اور گزرے حدود سے۔ داخل کرے گا اُس کو آگ میں۔ اور وہ ہمیشہ رہیگا اس میں۔ اور اس کے لئے عذاب ہے بڑا۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ		(آل عمران - ۱۷۴)

پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر

واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول		(مائدہ - آیت ۹۰)

اور فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی (نور ۵۵)

واطیعوا الرسول لعلکم ترحمون (سورہ نور۔ آیت ۵۵)

اور اطاعت کرو رسول کی شاید تم بخشے جاؤ۔

یاایھا الناس قد جاءکم رسول بالحق من ربکم فامنو

اے لوگو۔ آیا پاس تمہارے پیغمبر ساتھ حق کے تمہارے رب کی طرف

سے۔ پس ایمان لاؤ۔ (سورہ نسا۔ آیت ۶۶)

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ

ذُنُوْبَکُمْ (آل عمران۔ ۲۷)

کہ تحقیق اگر تم چاہتے ہو اللہ کو۔ تو پیروی کرو میری چاہے گا تم کو

اللہ اور بخش دے گا گناہ تمہارے۔

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ

سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَاءَتْ

مَصِیْرًا ۝

اور جو نافرمانبرداری کرے رسول کی بعد اس کے کہ ظاہر ہوئی ہدایت

اور پیروی کرے سوائے راہ مسلمانوں کے۔ ہم اسے پھیریں گے۔

جس طرف وہ پھرا ہے۔ اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے۔

اور وہ بری جگہ ہے۔

غیرمسلموں کو دوزخ! رسول کی فرمانبرداری نہ کرنے والے کو

دوزخ!! کسی کا حضرت رسول کے فرمان سے ذہنی اتفاق نہ ہو

تو وہ دوزخ کا مستوجب ہے!!!

سزا و جزا کے باب میں ہم حضرت رسول کی ازواج مطہرات

کو حضرت رسول کی فرمانبرداری کا دو چند اجر ملنے کے وعدہ کا ذکر کر چکے ہیں - ایک اجر اس لئے ملتا ہے - کہ اللہ میاں کی خوشنودی اس میں ہے اور ایک اجر اس لئے کہ حضرت پیغمبر بھی خوش ہیں - عمل ایک لیکن اللہ میاں کی اس سے خوشنودی ہوئی - اس کا الگ ثمر - اور حضرت رسول خوش ہوئے - اس کا الگ پھل - اور ابھی شرک نہیں ہوا!

ممکن ہے - حضرات مسلمین کہیں - کہ حضرت رسول کا حکم سوائے اللہ کے حکم کے اور کچھ نہیں - تو پھر یہ کہنے میں ہرج کیا تھا - کہ جو اللہ کی طاعت کرے - وہ بہشت میں جائیگا - رسول کی طاعت کو اس میں ایزاد کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ حضرت کا اپنا وجود - جذباتی - ادراکی - افعالی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اللہ اور رسول میں فرق کیا ہے؟ رسول کو بھی اللہ مان لینے میں ہرج کیا؟ اور اگر کوئی شخص اس فلسفیانہ تمیز کو مدنظر رکھ کر فقط اللہ پر ایمان لائے - اور رسول کو کلمہ میں شریک نہ کرے - تو اس کی نجات ہوگی یا نہیں؟ اگر رسول فقط آلہ کار ہے - تو آلے پر ایمان لانے کی ضرورت؟ کوئی کہے - اللہ کا حکم بغیر رسول کے انسان کو نہیں پہنچتا - تو حضرت رسول کو کیونکہ بلا واسطہ پہنچتا ہے؟ اور اگر انہیں بھی فرشتوں کے توسّل کی ضرورت ہے - تو کلمہ میں اللہ اور رسول کے ساتھ جبریل کا نام کیوں نہ بڑھا دیں - پھر حضرت جبریل کو وہ پیغام کیونکر پہنچتا ہے؟ اگر معبود کے ساتھ ساتھ اس کے سب آلوں پر ایمان لانا بھی نجات کے لئے لازم ہے - تو ان آلوں کی کوئی حد نہ رہیگی - اور کلمہ اتنا لمبا ہو جائیگا - کہ ازل سے ابد تک اس کی قرأت کرو - ختم نہ ہو -

ایک اور فلسفیانہ سوال ہے۔ اس پہ غور کرو۔ انسانوں کو قرآن کا پیغام پہنچانے کے لئے حضرت محمد کو اللہ میاں نے انتخاب کیا۔ کیوں ؟ یہ انتخاب ازل سے ہو چکا تھا ؛ یا بعد میں ؟ چلو۔ کسی وجہ سے۔ غالباً بغیر وجہ کے یہ انتخاب کر لیا گیا۔ کیا امکان بھی کسی اور کے انتخاب کا تھا یا نہ ؟ اگر تھا۔ تو حضرت محمد کی شخصیت کی خصوصیت نہ رہی۔ جو کوئی رسالت کے منصب کے لئے منتخب ہوتا۔ اس کا نام کلمہ میں آجاتا۔ اور اگر کوئی اور نام بھی کلمہ کا جزو ہو سکتا تھا۔ تو کیا فلسفیانہ طور پہ یہ زیادہ اچھی صورت نہیں۔ کہ خاص نام وہاں رکھا ہی نہ جائے۔ کیونکہ فضیلت تو یہاں رسالت کے منصب کی ہے۔ خاص شخصیت کی نہیں۔

نقص یہ ہے کہ قرآن میں اللہ اور اس کے رسولوں میں تمیز نہ کرنے کی ہدایت ہے۔ جیسے مندرجہ ذیل آیت میں

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ
اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ
اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا ط
وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ۝ (نسا - آیات ۱۵۰-۱۵۱)

تحقیق جو انکار کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسولوں سے اور چاہتے ہیں کہ فرق کریں بیچ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے۔ اور کہتے ہیں ہم ایمان لاتے ہیں بعض پر اور انکار کرتے ہیں بعض سے اور چاہتے ہیں اختیار کرنا کوئی بیچ کی راہ۔ وہی کافر ہیں اصلی۔ اور ہم نے تیار کیا ہے واسطے کافروں کے عذاب سخت۔

لیجئے۔ اصل کافر کی تعریف بھی ہو گئی۔ وہ جو اللہ اور اس کے رسولوں

میں فرق کرے۔ ایک پر ایمان لائے اور دوسرے سے انکار کرے۔
وہ دوزخی ہے۔ جبھی تو بعض اہل اسلام گایا کرتے ہیں۔ ع۔

معراج کی رتیاں حق نے کہا۔ میں اور نہیں تو اور نہیں
ہے میم کا پردا کیا پردہ میں اور نہیں تو اور نہیں

ایک اور شعر مشہور ہے۔

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے؟ جو کچھ ہمیں لینا ہے۔ لے لینگے محمد سے

اور ابھی مسلمان موحد ہیں! واقعی اگر فرق سمجھ کر طاعت کرتے۔ کہ اللہ کی طاعت کا رسول کی طاعت سے کوئی مقابلہ نہیں۔ تب تو واقعی دو کی طاعت ہو جاتی۔ یہاں تو ایک ہی سانس میں دونو کی طاعت پر زور دیا ہے۔ اور کہا ہے۔ فرق مت کرو۔ شریک تو نہیں کیا۔ دونو کو ایک کر دیا ہے۔ اب شرک کہاں رہا؟ یہ تو پوری توحید ہے۔

اب اللہ اور رسولوں میں فرق تو نہیں رہا۔ اور حضرت آدم بھی رسول تھے۔ سب سے اوّل رسول۔ جنہیں اسماء کلھا سکھائے گئے۔ ہاں بعد میں پھر کہا۔ فتلقی آدم من ربہ کلمات۔ کچھ باتیں سیکھے تھے۔ خیر۔ رسول ہونے سے ان میں اور اللہ میاں میں بھی فرق نہ کرنا چاہیئے۔ تو جب فرشتوں کو حکم دیا۔ کہ

اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (سورہ بقر۔ آیت ۳۴)

سجدہ کرو آدم کو۔

تو اسی خیال سے کہا ہوگا۔ کہ اللہ اور رسل میں فرق کرنے والا کافر ہے۔ شیطان نے فرق کیا۔ اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور وہ

كَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ (سورہ بقر۔ ۳۴)

اور وہ تھا کافروں میں سے ایک۔

قرار دیا گیا۔ داقعی فرق کرنے والا مشرک ہے۔ اس لئے دو ماننے اور ایک ماننے والا موحد! اچھی توحید ہے۔ تب تو وحدت وجود ہی ماننا ہوگی۔ اسی خیال سے کہا ہوگا۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝ (سورہ بقر۔ آیت ۹۸)

جو دشمن ہے اللہ کا اور فرشتوں کا اور رسولوں کا اس کے اور جبرئیل کا اور میکائیل کا۔ پس تحقیق اللہ دشمن ہے کافروں کا۔

رسول کی دشمنی تو سمجھ میں آئی۔ اللہ۔ فرشتوں۔ جبرائیل اور میکائیل کی دشمنی کے کیا معنے؟ یہی کہ ان کی دشمنی سے اللہ دشمن ہو جاتا ہے۔ مگر وہ دشمنی کچھ سمجھ سے اوپر اوپر کی بات ہے۔ جیسے خود اللہ میاں کی مؤخر الذکر دشمنی بھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی کونسل ہے۔ ایک کا راج نہیں +

فرشتے

گذشتہ باب کے خاتمہ پر فرشتوں کا ذکر آیا تھا۔ کہ اُن کے دشمن کا اللہ میاں دشمن ہے۔ یہ فرشتے کیا ہیں؟ فرماتے ہیں۔

اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ

کیا یہ کفایت نہ کرے گا کہ مدد کرے تمہاری رب تمہارا ساتھ تین ہزار فرشتوں کے۔ (سُورہ آلعمران - ۸)

غزوہ بدر میں تین ہزار فرشتوں کے اہل اسلام کی امداد پر آنے کا ذکر ہے۔ ان کی مدد سے اہل اسلام کامیاب ہوئے۔ لڑائیاں تو اہل اسلام کو بعد میں بھی پیش آتی رہیں۔ لیکن یہ فوج کہیں اور آئی ہو۔ اس کی روایت نہیں۔ فرشتوں میں لڑنے کی طاقت ہے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اس کا مصرف پھر نہیں ہوا۔ شاید تب بھی نہ ہوا ہو۔ یہی بات مندرجہ ذیل آیت میں ہے۔

وَاَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا (توبہ - ۲۵)

اور اُتارے لشکر۔ نہیں دیکھا اُن کو تُو نے

حضرت پیغمبر نے بھی وہ لشکر نہیں دیکھے۔ وہ آئے۔ لڑے مسلمانوں کو فتح دلا گئے۔ اور پتہ بھی نہ لگا۔ کہ آتے تھے۔

یہ تو ایک خدمت ہوئی۔ جو ایک وقت اُن سے لے لی گئی بالعموم وہ کیا کرتے ہیں؟ لکھا ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ (سورہ معارج - آیت ۴)

چڑھتے ہیں فرشتے اور رُوح طرف اُس کے اُس کے دن میں جس کی مقدار ہے پچاس ہزار برس۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (سورہ سجدہ - آیت ۴)

تدبیر کرتا ہے کام کی آسمان سے زمین کی طرف پھر چڑھتا ہے اُس کی طرف ایک دن میں جس کی مقدار ہے ہزار برس تمہارے حساب سے ہمارے حساب کا ہزار برس یا پچاس ہزار برس فرشتوں کا ایک دن ہے۔ تضاد کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اللہ میاں کے آسمان پر رہنے کی وجہ سے ان کارندوں کی ضرورت پر بھی نظر ڈالی جا چکی ہے۔ قیامت میں ملائک کا ذکر ہے۔ کہ

وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (سورہ حاقہ)

اور ہوں گے فرشتے اُوپر طرفوں کے اس کے۔ اور اُٹھائیں گے تخت تیرے رب کا اُوپر اپنے اُس دن آٹھ شخص۔

یہ آٹھ شخص کیسے ہونگے؟ اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان کی شکل پہاڑی بکرے کی سی ہوگی۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۭ (سورہ نبا - ۳۶)

اُس دن کھڑے ہونگے روح اور فرشتے صف باندھ کر۔

جبرئیل جو الہام لاتا ہے اور جس نے حضرت مریم کو بغیر خاوند کے

لڑکے کی خبر دی تھی - اُس کا ذکر گذشتہ بابوں میں ہو چکا ہے - اس کی ضرورت عدم ضرورت پر بھی مختصراً تبصرہ کیا جا چکا ہے - آخر میں ملک الموت کا ذکر بھی کر دیں -

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ

(سورہ سجدہ - آیت ۱۰)

کہ قبض کرے گا تم کو فرشتہ موت کا جو مقرر کیا گیا ہے تم پر -

وَلَوْ تَرٰى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝

(سورہ انفال - آیت ۴۸)

کاش کہ تو دیکھے جب قبض کرتے ہیں ان لوگوں کو - کہ کافر ہوئے فرشتے مارتے ہیں اُن کے مُنہ پر اور پیٹھ پر اور (کہتے ہیں) چکھو عذاب جلنے کا -

موت کے لئے فرشتہ مقرر کرنے کی ضرورت کیا ہے ؟ جب اللہ میاں ہر جگہ موجود ہے - اور لوگوں کو مار اور زندہ کر سکتا ہے - تو اس کے اور انسانوں کے بیچ میں ایک اور واسطے کے کیا معنے ؟ آسمانوں پر بیٹھے کو اس کی احتیاج ہو سکتی ہے - حاضر و ناظر کو نہیں جیسے الہام کے لئے فرشتے کو واسطہ بنانے سے سوال پیدا ہوتا ہے - کہ فرشتے اور اللہ میاں کے درمیان پھر اور کون واسطہ ہوگا ؟ ویسے ہی ملک الموت کے متعلق بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے - کہ اگر اسے مارنا مطلوب ہو - تو کسے اس خدمت پر مامور کیا جائے گا ؟ کیونکہ قرآن میں کہا ہے - کہ اللہ میاں کی ذات کے سوا اور کوئی موجود باقی

نہیں۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (القصص - رکوع ۹)

جب سب فانی ہیں۔ اور ہر ایک کی فنا کے لئے ملک الموت آلہ کا کام دیتا ہے۔ تو اس کی اپنی فنا کے لئے اور وسیلہ کون سا ہوگا؟ حق یہ ہے۔ کہ اگر پرماتما کے ہر فعل کے لئے اس کے اور اس کے مفعول کے درمیان وسیلہ مان لو۔ تو پھر وسیلوں کی انتہا نہیں ہوگی بہتر یہ ہے۔ کہ اس کے لئے اور وسیلہ تسلیم ہی نہ کرو۔ اس فاعل مطلق کو فاعل مطلق یعنی بے واسطہ رہنے دو +
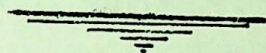
قرآن کا علم (۹) طبیعات

کسی کتاب کے ازلی ابدی یا دوسرے لفظوں میں الہامی ہونے کی ایک کسوٹی یہ ہے۔ کہ اس میں جس قدر بیانات ہوں۔ علوم معرفہ کے مطابق ہوں۔ انسان کبھی کسی قانون قدرت سے واقف ہو جاتا ہے۔ اور کبھی اسے بھول کر اس کی جگہ وہم اور قیاس کی بنیاد پر غلط اوہام کی تعمیر کرتا ہے۔ پرماتما علیم کل ہونے سے اس نقص سے بری ہے۔ اور اس لئے پرماتما کی کتاب میں کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی۔ جس کی تردید قدرت کے قانون کرتے ہوں۔ عالم کا کارخانہ پرماتما کے علم کا اطلاق ہی تو ہے۔ قرآن کے علم الغیب کے متعلق ہم گذشتہ بابوں میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں ناظرین نے دیکھ لیا۔ کہ فلسفہ کس حد تک قرآنی قیاسات کا ساتھ دے سکتا ہے؟ کہیں کہیں ایسے اقتباس بھی دیئے جا چکے ہیں۔ جن کا علوم طبعی سے بھی صاف تضاد پایا جاتا ہے۔ یہاں ہم اس مضمون کی چند ایک آیات جمع کرینگے اور انصاف ناظر پر چھوڑیں گے۔ کہ کیا وہ کتاب جو ان بیانات سے پُر ہے۔ الہامی کہی جا سکتی ہے؟

سورہ بقر آیت ۲۲ میں آیا ہے۔

اَلَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً (بقر۔۲۲)

جس نے بنائی تمہارے لئے زمین بچھونا اور آسمان چھت۔

آسمان کو چھت فقط شاعرانہ انداز سے ہی نہیں کہا۔ سورہ رعد میں

فرمایا ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَہَا (رعد۔ ۲)

اللہ ہے جس نے بلند کیا آسمانوں کو بغیر ستون کے جو تم دیکھ سکو۔

اِس آیت پر تفسیر حسینی میں لکھا ہے۔

لازم مے آید کہ ستون ہست لیکن مرئی شما نیست

لازم آتا ہے کہ ستون تو ہیں۔ لیکن تم سے دیکھے نہیں جاسکتے۔

یہی بات سورہ لقمان میں کہی ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَہَا (لقمان۔ ۱۳)

پیدا کیا آسمانوں کو بغیر ستونوں کے جو تم دیکھتے ہو۔

آسمان کا پھٹنا بھی فرمایا ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (انفطار۔ ۱ تا ۴)

جب آسمان پھٹ جائے۔ اور جب تارے جھڑ جائیں۔ جب دریا چیرے جائیں۔ اور جب قبریں زندہ ہو کر اُٹھائی جائیں۔

وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ (فرقان۔ آیت ۲۳)

اور جس دن پھٹ جائے گا آسمان بدلی سے۔

تفسیر حسینی میں فرمایا ہے۔

بشگافد آسمانہا بہ سبب ابر سفید کہ بالائے ہفت طبقہ آسمانست۔ و غلظ او برابر ہمہ سماوات و او گراں تر است از ہمہ آسمانہا و حق سبحانہٗ امروز او را بقدرت نگہداشتہ۔ روز قیامت او را بر آسمانہا افگند و ہر آسمانے کہ رسد۔ آں آسمان شگافتہ گردد۔

پھٹ جائیں گے آسمان بہ سبب سفید بادل کے جو سات طبقہ آسمان کے اُوپر ہے۔ اور جس کا حجم تمام آسمانوں کے برابر ہے۔ اور وہ بھاری ہے سب آسمانوں سے۔ اور حق تعالیٰ نے اب اسے اپنی قدرت سے روکا ہوا ہے۔ قیامت کے روز اسے آسمانوں پر گرائے گا۔ اور وہ جس آسمان پر پہنچیگا۔ وہ آسمان پھٹ جائیگا۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ (حاقہ - آیت ۲۴)

اور پھٹ جائے گا آسمان اور وہ اس دن سست ہوگا۔

لیجئے آسمان چلتا بھی ہے۔ سات آسمانوں کا ذکر تفسیر میں تو آہی گیا۔ اب قرآن کی آیات میں دیکھئے۔

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ (نوح - ۱۴-۱۵-۱۶)

کیا نہیں دیکھا تم نے پیدا کئے اللہ نے سات آسمان اوپر تلے۔ اور بنایا چاند ان کے بیچ میں نور۔ اور بنایا سورج کو چراغ۔

اب چھت ایک نہ رہی۔ سات ہو گئیں۔ ان کے بیچ میں چاند اور سورج رکھے گئے۔ اس پر سوال یہ ہوگا۔ کہ کیا ان اجرام کے نور ان چھتوں کے بیچوں بیچ رک نہیں جاتے؟ ممکن ہے کوئی کہے۔ یہ چھتیں شفاف ہیں۔ شاید بلور کی ہوں۔ قرآن فرماتا ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ (تکویر - آیت ۱۱)

جب آسمان کی کھال اتاری جائے۔

تفسیر جلالین میں کہا ہے۔

جیسا کہ بکری کا چمڑا نکالا جاتا ہے۔

ایسے آسمان سے پانی اُترنے کا ذکر آئے۔ تو کیا سمجھا جائے۔

کہا ہے۔

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً (رعد - ۱۰)

اُتارا آسمان سے پانی۔

ان ٹھوس چھتوں میں تبخیر کے عمل سے پانی پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ یہ پانی تو وہیں سے گرایا جائیگا

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ (حج - ۱۷)

کیا نہیں دیکھا تو نے یہ کہ اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو آسمانوں میں ہیں۔ اور وہ جو زمین میں ہیں۔ اور سورج اور چاند اور پہاڑ اور درخت۔

ہم اس عبارت میں استعارہ سمجھ لیتے۔ مگر اوپر کے بیانات کی روشنی میں اسے استعارہ نہیں کہا جا سکتا۔ چاند اور سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کو اور پہاڑوں اور درختوں کے سایہ کو وہاں سجدہ سمجھا گیا ہے۔ دیگر مقامات پر سائے کے بڑھنے گھٹنے کو اچنبھا سمجھا ہے۔ علم طبعی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے انسان ایسے قیاسات کر بیٹھتا ہے۔ اس میں وہ معذور ہے۔ ہاں الہامی کتاب میں یہ توہمات ہرگز نہیں ہو سکتے۔

یہ ہوئی آسمان کی کیفیت۔ سورج کی بھی سن لیجئے۔

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ۔ (تکویر۔ آیت ۱)

جب سورج لپیٹا جائے۔

سورہ کہف میں ذوالقرنین کا ذکر ہے۔ دوران تذکرہ میں کہا ہے
حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ
(سورہ کہف ۔ آیت ۸۶)

حتیٰ کہ جب وہ پہنچا سورج کے غروب ہونے کی جگہ پر اور پایا اس
کو ڈوبتا چشمہ میں کیچڑ کے۔

مصنف قرآن کے خیال میں مغرب کوئی جگہ ہے وجہاں سورج
کیچڑ کے چشمہ میں جا پڑتا ہے۔ آج کل کے مولانا لکھتے ہیں۔ ذوالقرنین
نے لاعلمی سے ایسا سمجھا۔ اور قرآن نے اسے جوں کا توں لکھ دیا۔
قرآن کی تاریخی صحت تو قابل تعریف ہے لیکن کہیں ناظر اس بیان پہ
قرآن کی تصدیقی مُہر نہ سمجھ بیٹھے۔ غلط فہمی کا ازالہ بھی تو کر دینا تھا۔ آخر
کہیں تو لکھا ہوتا۔ کہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ کیچڑ نہیں۔
پانی میں سورج کا جا پڑنا شارحین قرآن کے دلوں پر ایسا ثبت ہوا ہے۔
کہ ہر مقام پر ایسا ہی ذکر آیا ہے۔

وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ۔

اور اکٹھا کیا جائیگا سورج اور چاند
تفسیر حسینی میں اس کی توضیح کی ہے۔
یعنی ایشاں را بایک دیگر مجتمع ساختہ در دریا افگنند
یعنی انہیں آپس میں اکٹھا کرکے دریا میں ڈال دیں گے۔
آسمانوں کی باتیں ہولیں۔ اب زمین کی سنئیے۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ (واقعہ ۴)

جب ہلائی جائیگی زمین اور ٹکڑے ہوں پہاڑ ٹوٹ کر۔

دوسرے لفظوں میں اس وقت ساکن ہے۔ اس ہلنے کے ساتھ پہاڑوں کا ٹوٹنا کیا ہے؟

وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِہِمْ (انبیا - ۳۱)

اور بنائے بیچ زمین کے پہاڑ۔ ایسا نہ ہو کہ ہل جائے۔

وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ (لقمان - ۹)

اور ڈالے بیچ زمین کے پہاڑ۔ ایسا نہ ہو کہ ہل جائے۔

تفسیر حسینی میں لکھا ہے۔

دور موضح از ضحاک نقل مے کند۔ کہ حق سبحانہٗ نوزدہ کوہ را میخ زمین کرد تا بر جائے برایستد۔

اور موضح میں ضحاک سے روایت کی ہے۔ کہ حق تعالےٰ نے انیس پہاڑ زمین کے لئے میخیں بنائے۔ تاکہ ایک جگہ پر ٹھیرے۔

معجزات کے باب میں کئی خارق عادت افعال کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ جنہیں اللہ میاں کی نشانیاں کہا گیا ہے۔ ایسے موقعے پہ آیت یا نشانی کے معنے معجزہ ہوتے ہیں۔ باب مذکور میں جس قدر نشانیوں کا ذکر ہوا ہے۔ وہ اللہ میاں کے معجزے ہیں۔ ایک دو معجزے اور بیان کئے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ فِی الَّیْلِ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰہِ لِیُرِیَکُمْ مِّنْ اٰیٰتِہٖ ط (سورہ لقمان - آیات ۲۸ - ۳۰)

کیا نہ دیکھا تو نے کہ اللہ داخل کرتا ہے۔ رات کو دن میں۔ اور داخل کرتا ہے۔ دن کو رات میں۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ کیا نہ دیکھا تو نے کہ

کشتیاں چلتی ہیں دریا میں بفضل خدا - تاکہ دکھلائے تم کو بعض نشان اپنے -

بھولے بھالے اہل عرب کی نظر میں دن کے پیچھے رات - اور رات کے پیچھے دن ہونا اور ٹھوس کشتی کا دریا کی سطح پر چلنا نشانیاں تھیں - معجزے تھے - وہ بیچارے کیا جانیں - کہ زمین گھوم رہی ہے - اور اس کا جو حصہ سورج کے سامنے آتا ہے - وہ روشن ہو جاتا ہے جو حصہ اس سے اوجھل ہوتا ہے - وہاں رات ہوتی ہے - ان کی نظر میں تو سورج گدلے چشمہ میں جا ڈوبا - اور پھر باہر لایا گیا - انہیں آرچیمیڈیز کا یہ اصول کیا معلوم کہ پانی کا اپنا بوجھ ہوتا ہے - جو اپنے سے کم بوجھ کو اپنے اوپر اٹھا رکھتا ہے !

ستاروں کے جھڑنے - گدلا ہونے کا بیان اوپر ہو چکا - اب ان کے برج ہونے کی کہانی بھی سن لیجئے -

والسماء ذات البروج (سورہ برج - آیت ۱)

قسم ہے آسمان برجوں والے کی

بروج کا ترجمہ کیا ہے تفسیر حسینی والے نے -

یا منازل قمر یا درہائے آسمان

یا چاند کی منزلیں یا آسمان کے دروازے -

سوامی دیانند پوچھتے ہیں -

اگر حمل وغیرہ برجوں کو برج کہتا ہے - تو اور برج کیوں نہیں ہیں ؟

برج کے دو معنے ہیں - ایک تو وہ جنہیں تفسیر حسینی میں منزلیں کہا - دوسرے دروازے جیسے قلعوں کے ہوتے ہیں - اور قرآن میں کئی جگہ

یہ ذکر آیا ہے۔ کہ جب جن ان برجوں پر پہنچتے اور آسمانوں میں ہو رہی اللہ میاں اور فرشتوں کی کونسلیں سننا چاہتے ہیں۔ تو انہیں مارا جاتا ہے۔ جہاں آسمانوں کو قلعہ اور تاروں کو ان کے دروازے کہا گیا ہو۔ وہاں علوم معرفہ کا تو کمال ہی ہوگا۔ چنانچہ سورہ حجر۔ رکوع ۲ میں ذکر ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَّزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ٥ وَحَفِظْنَاهَا مِن كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ٥ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ ٥

اور ہم نے بنائے آسمان میں برج۔ اور انہیں ناظرین کے لئے زینت دی۔ اور حفاظت کی ہر شیطان سے۔ مگر جو اُس نے چوری سے سن لیا۔ پس اس پر پڑتا ہے شعلہ ظاہر۔

موضح القرآن میں لکھا ہے۔

فرشتوں کی مشورت سننے کو شیطان جاتے ہیں آسمان کے قریب اُوپر سے انگارے پڑتے ہیں۔

اللہ کے مُردوں کو زندہ کرنے کا ذکر معجزات کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ ایک مُردہ گائے کا کوئی جزو لگنے سے جی اُٹھا۔ بعض زندوں کو کھڑے کھڑے انسان کے قالب سے بندر کے قالب میں ڈال دیا گیا۔ یہ تمام اعجاز پُرانے زمانے ہی کے لئے مخصوص تھے۔ آج ان کا استعمال نہیں۔

سورہ حم سجدہ میں فرمایا ہے۔

لمحی الموتی (آیت ۳۸)

البتہ زندہ کرنے والا ہے مُردوں کا۔

مفسران قرآن کی نظر میں اس زندگی سے پیشتر کی حالت کو بھی جو ان کے عقیدے کے مطابق محض عدم کی تھی۔ قرآن کی اصطلاح میں موت کہتے ہیں۔ تو کیا موجودہ زندگی کے بعد کی حالت بھی محض عدم کی حالت ہوگی؟ اگر ایسا ہو۔ تو اس عدم کے بعد کی زندگی بالکل نئے موجودات کی زندگی ہوگی۔ کیونکہ اگر دو وجودوں میں محض عدم کا فاصلہ ہو جائے۔ تو وجود کا تواتر نہ رہنے سے موجود دو ہو جاتے ہیں۔ ایک نہیں رہتا۔ اگر یہ صورت ہو۔ تو قیامت کے روز مجرم حساب کے لئے نہ بلائے جائیں۔ بلکہ ان کی جگہ کوئی اور ارواح حاضر ہوں۔ یہ قرآن کا عقیدہ نہیں۔ تب قرآن کی نظر میں موت محض عدم کا نام نہ ہوگا۔ بلکہ روح کے جسم سے الگ ہو جانے کو موت کہتے ہونگے۔ مگر کھڑی پھر قبریں ہونی ہیں۔ اور منکیر نکیر سے بھی قبر ہی میں واسطہ ہوتا ہے۔ تب تو جسم اور روح کی جدائی بھی موت کی مترادف نہیں۔ بلکہ روح کا کچھ عرصہ کاروبار سے معطل رہنا موت کا مترادف ہے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ انہیں معطل کیوں کیا جاتا ہے؟ کام کا سامان موجود ہے۔ کارخانہ عالم چل رہا ہے۔ اور ایک زندگی میں سب ارواح نے اپنا روحانی ارتقا پورا بھی نہیں کیا ہوتا۔ تب کیوں نہ انہیں اور موقعہ دیا جائے؟ بہرحال ارواح کی ہستی میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے۔ جب وہ کوئی عمل نہیں کرتے۔ اور اسے اسلام کی اصطلاح میں موت کہا جاتا ہے۔ تو کیا یہی بات اللہ میاں کے متعلق نہیں کہی جا سکتی؟ موجودہ آفرینش سے پیشتر وہ موجود تو تھا۔ لیکن کوئی کام نہ کرتا تھا۔ تو اس وقت اس پر کیا حالت طاری تھی؟ اور جو حالت ایک دفعہ گزر چکی۔ وہ کیا پھر عود نہ کریگی؟ پھر یہ کس مطلب سے کہا جاتا ہے۔ کہ اللہ میاں موت

کی زد میں نہیں آتا؟ آریہ تو موت کے معنے سمجھتے ہیں۔ جسم سے الگ ہونا۔ پرماتما کا جسم ہے ہی نہیں۔ اس لئے وہ اس سے الگ بھی نہیں ہوتا۔ مگر اسلامی خیال کے مطابق روح جسم سے الگ تو ہوتی نہیں انہیں قبروں کو چالیس دن کی بارش سے زندہ ہو اُٹھنا ہے۔ پھر موت کی تعریف ہوئی معطل ہونا۔ اور اللہ میاں اس کثرت کے دور سے پہلے کچھ ایسے ہی تھے۔ اور احمدیوں کے عقیدے کے مطابق پھر بھی جب وحدت کا دور آئے گا۔ تو ایسے ہی ہو جائیں گے۔ انہیں لایموت کن معنوں میں کہا جائے؟ یہ ہوئی زندگی کے بعد کی بات۔ یہ زندگی کیسے بخشی گئی؟ سورہ نور میں کہا ہے۔

وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَابَّۃٍ مِّنْ مَّاءٍ فَمِنْھُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِہٖ ج

(سورہ نور - آیت ۴۵)

اور اللہ نے بنائے تمام جانور پانی سے۔ پس اس میں بعض چلتا ہے اوپر پیٹ اپنے کے۔

جانوروں کے جسم میں محض پانی نہیں ہوتا۔ اور عنصر بھی رہتے ہیں۔ یہ اسی غلطی کی ایک اور شکل ہے۔ جس کے ماتحت انسان کو مٹی سے پیدا ہوا کہا جاتا ہے

قرآن اور اس کی تفسیروں میں عجیب و غریب پیدائش کے تو کئی نمونے ہیں۔ مثلاً فرشتے کہ پر کو ہی ہیں۔ جن کے شموں سے لے کر زانو تک ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک کا فاصلہ ہے۔ جن اور شیطان کہ آگ کے پرکالے ہیں۔ ذیل میں ایک اور مخلوق کا ذکر کیا جائیگا جو ان سب کو مات کرتی ہے۔

قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ

(سورہ کہف - آیت ۹۱)

کہا - اے ذوالقرنین تحقیق یاجوج اور ماجوج فساد کرنے والے ہیں زمین میں -

تفسیر حسینی میں لکھا ہے -

در عین المعانی آوردہ اند کہ آدم علیہ السلام را احتلام شد - ومنی او بخاک آلودہ گشت - آدم ازاں حال اندوہناک گشت - حق تعالیٰ ایں دو قوم را ازاں خاک آلودہ منی ابوالبشر بیافرید -

عین المعانی میں روایت ہے - کہ آدم علیہ السلام کو احتلام ہوا - اور اس کا نطفہ خاک میں مل گیا - آدم اس بات سے رنجیدہ ہوا - حق تعالیٰ نے ان دو اقوام کو حضرت آدم کی اس خاک آلودہ منی سے پیدا کیا -

آگے پھر لکھا ہے -

در حدیث آمدہ کہ صنفے از ایشاں بمثل شجرہ ارزند و آں درختے است در ولایت شام - طول او صد و بیست گز - و عرض مساوی آں - و صنفے کہ از یک گوش فراش سازند و از دیگر گوش لحاف مے سازند

اور حدیث میں روایت ہے - کہ ان کی ایک قسم شجرہ ار کی طرح ہیں - اور وہ درخت ہے ولایت شام میں - اس کا طول ایک سو بیس گز اور عرض اس کے برابر - اور ایک قسم ایسی ہے - کہ ایک کان سے بچھونا بناتی ہے - اور دوسرے کان سے لحاف -

یہ ہے اہل قرآن کا علم حیوانات - یہ جنس اس وقت تو ہے نہیں - اگر کبھی تھی بھی - تو اس کی خلقت کی غایت کیا یہی تھی - کہ وہ فساد ہی کریں؟

اس میں ان غریبوں کا تو قصور نہیں۔ کیونکہ وہ تو محض عدم سے وجود میں آئے۔ اس فساد کا بانی کون ہوا؟ خلق من العدم کے منطقی نتائج نہایت خطرناک ہیں۔ خیر وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ اس جنس کا پتہ علم حیوانات کی تاریخ سے ہی دو۔ یا محض قصّہ ہے؟

الہام کے نازل ہونے کی ایک غرض اوہام کا ازالہ کرنا ہے۔ ہم ایسے چند وہمی اوہام کا تذکرہ تو اس باب میں کرہی چکے ہیں۔ جو خود قرآن میں بطور حقائق کے مذکور ہوئے ہیں۔ چند خاص دنوں کی تقدیس وہم پرست مذاہب کا مشترکہ خاصہ ہے۔ اسلام بھی اس تقدیس سے خالی نہیں۔ چنانچہ سورہ قدر میں لیلۃ القدر کی فضیلت بیان کی ہے

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَا اَدْرٰكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ (سورہ قدر آیات ۱-۲-۵)

تحقیق ہم نے نازل کیا قرآن لیلۃ القدر میں۔ اور کیا جانے تو کیا ہے لیلۃ القدر۔ اترتے ہیں فرشتے اور روح اس میں ساتھ حکم پروردگار اپنے کے واسطے ہر کام کے۔

سارے قرآن کا نزول ایک دفعہ تو ہوا نہیں کبھی یہ آیت کبھی وہ آیت۔ پھر یہ کیا کہ نزول کے ان سارے اوقات میں سے لیلۃ القدر کو بالخصوص برکت کے لئے منتخب کر لیا ہے؟ کیا لیلۃ القدر میں نازل ہوئے قرآن کے اجزا دیگر اجزا کی نسبت بالخصوص ممتاز ہیں؟ اس امتیاز کی روایت ہمیں کہیں نہیں ملی۔ مولانا ثناء اللہ نے ان آیات کی ایک اور تفسیر کر ڈالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ یہ آیات اتری ہی لیلۃ القدر کی

فضیلت میں ہیں۔ قرآن کے کسی حصّے کے نزول کا اس فضیلت سے تعلق نہیں۔ تو پھر اس رات کی فضیلت کیا ہے؟ کہا ہے

خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ (سورہ قدر - ۴)

یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

وہ کس بات میں؟ فرشتے اور رُوح تو ہر رات خدائی کاروبار کے لئے اترتے ہونگے۔ اگر خدا کو ان کی ضرورت ہے۔ تو ہمیشہ ہے۔ اور نہیں۔ تو اس رات بھی نہیں۔ پھر یہ کیا کہ ایک خاص رات کو متبرک بنا دیا ہے۔ اور وہ ایک ایسے وہم کی بنیاد پہ جو معقول پسندوں کے لئے چیستاں ہے۔ دن اور راتیں سب مبارک ہیں۔ ہمارے اپنے اعمال انہیں اچھا اور بُرا بناتے ہیں۔

فرشتوں کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ قرآن میں کہیں کہیں روح کا ذکر ہُوا ہے۔ کہ وہ آسمان سے زمین پہ آتا ہے۔ یہ روح کیا چیز ہے؟ مفسروں نے اسے بھی فرشتہ مانا ہے۔ تب اس کا نام فرشتوں کے علاوہ کیوں لیا جاتا ہے؟ وہ لیلۃ القدر میں آتا ہے۔ حضرت مریم کو حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی خبر دینے آیا تھا۔ عیسائیوں کی تثلیث میں روح القدس شامل ہے۔ ممکن ہے۔ اسی کا شمول یہاں فرشتوں میں کیا ہو۔ عیسائیت کے عقیدے میں وہ بھی معبود ہے۔ یہاں بھی یہ فرشتوں میں بالخصوص ممتاز معلوم ہوتا ہے فرشتہ اکیلا ہے۔ اس کا نظیر کوئی نہیں۔ اسے بھی واحدہٗ لاشریک کہا جا سکتا ہے۔ تو کیا وہ لاشریک ہو نے میں اللہ میاں کا شریک نہ ہو جائے گا؟ اس کا وجود تسلیم کرنے کی فلسفیانہ ضرورت کیا ہے؟ یہ معمّا کسی مفسر نے واضح نہیں کیا۔ ایک موہوم ہستی ہے جو اسلام کے اوہمات کا جزو ہے۔ تو یہ بات کو معقولیت سے کیا سروکار ہے؟ ہم اس کی تنقید اسلئے کر دیتے ہیں کہ یہ ایک الہامی کتاب میں گویا ہے الہام اور وہم؟ دو متضاد باتیں ہیں۔

اللہ میاں کا گھر

ہم اوپر آدم کے بہشت سے نکالے جانے کا قصہ بیان کر چکے ہیں۔ وہاں لکھا ہے۔

فَاخْرُجْ مِنْهَا (سورہ ص۔ آیت ۷۰)

پس نکل ان آسمانوں سے۔

آسمانوں سے نکل جانے کے معنی کیا؟ کیا آسمانوں پر اللہ میاں کا خاص قبضہ ہے۔ اور دوسری جگہ وہ قبضہ نہیں؟ یا اللہ! تو اپنی ولایت سے کسی کو نکال بھی دینا چاہے۔ تو نہ نکال سکے۔ جب تک کہ اسے قطعاً معدوم نہ کر دے۔ اور قطعاً معدوم کر دیا۔ تو سزا کسے دی؟ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکم اسی طرح دیا گیا۔ جیسے کوئی بادشاہ اپنے مورد عتاب سے کہے میرے سامنے سے چلا جا۔ تو کیا آسمانوں پر اللہ میاں کے سامنے تھا۔ اور زمین پر نہیں؟ آسمان اللہ میاں کی بیٹھک ہوئی نہ؟ اور زمین محض ملک؟ نہیں۔ زمین میں بھی کئی جگہیں اللہ کی مخصوص ہیں۔ فرمایا ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ط (سورہ بقر۔ آیت ۱۲۶)

اور جب بنایا ہم نے گھر جائے ثواب لوگوں کی اور امن دینے والی اور پکڑو مقام ابراہیم کا واسطے نماز کے۔

یہ کعبہ کی برکت بیان فرمائی ہے۔ ساری زمین پرماتما کا گھر ہے۔ پھر

وجہ کیا کہ ایک خاص مکان کو ثواب کا مقام ٹھیرایا جائے؟ مسلمانوں اور عیسائیوں کی جنگ ہائے صلیبیہ اسی وجہ سے ہوئیں۔ اور مکّہ کے مُسلموں اور غیر مُسلموں میں بھی فقط ایک مندر کے لئے تنازعہ رہا۔ مکان کیا اور نہ بنایا جا سکتا تھا؟ اللہ میاں نے کہا ہی تو تھا۔

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝

(سورہ بقر۔ آیت ۱۱۶)

پس جس طرف تم مُنہ کرو۔ اُدھر ہی مُنہ ہے اللہ کا۔ تحقیق اللہ سمانے والا ہے جاننے والا۔

اس پر موضح القرآن میں لکھا ہے۔

یہ بھی یہود اور نصاریٰ کا جھگڑا تھا۔ کہ ہر کوئی اپنے قبلہ کو بہتر بتاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ اللہ بالخصوص ایک طرف نہیں۔ اس حکم سے جس طرف مُنہ کرو۔ وہ متوجہ ہوتا ہے۔

اس وقت تک یہود سے صلح تھی۔ اور حضرت اور اُن کے پیرو بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ مگر بعد میں آیت اُتری۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ

(سورہ بقر۔ آیت ۱۴۵)

تحقیق ہم دیکھتے ہیں پھرنا تیرے مُنہ کا آسمان میں۔ پس البتہ ہم پھیریں گے تجھ کو اس قبلہ کو کہ تُو پسند کرے اس کو۔ پس پھیرو مُنہ اپنا طرف مسجد الحرام کے اور جہاں کہیں کہ تم ہو۔ پس پھیرو مُنہ اپنے کو طرف اس کے۔

اب ضروری ہوا۔ کہ نماز کا رُخ اس طرف ہو۔ پھر وہ ہر طرف اللہ کا رُخ ہونے کے کیا معنی ہوتے؟ نماز ہی تو اصلی عبادت ہے۔ اگر اس میں مُنہ کعبہ کی طرف کرنا ضروری ہے۔ تو اللہ کا رُخ اِدھر ہی ہوا۔ اور پھر نبی کا مُنہ آسمان کی طرف پھرنے پر جو قبلہ بدلا گیا۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں۔ کہ خدا آسمان ہی میں ہے؟ اور اس کی ایک عبادت گاہ زمین پر قائم ہوئی؟ لیجئے۔ خود اللہ فرماتا ہے۔

وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْقَائِمِيْنَ ۔۔ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ ۔۔ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ (سورہ حج۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۹)

اور پاک کر گھر میرا واسطے گرد پھرنے والوں اور کھڑے رہنے والوں کے ۔۔ اور ذکر کریں اللہ کا۔ پھر دُور کریں میل اپنی اور پوری کریں نذریں۔ اور گرد پھریں گھر قدیم کے۔

لیجئے اسے اللہ نے اپنا گھر کہہ ہی دیا۔ جبھی تو وہاں جانا ضروری ہے اس کے گرد پھرنا ضروری ہے۔ ایک پتھر کے ٹکڑے کو بوسہ دینا ضروری ہے۔ کوئی پُوچھے۔ یہ بُت پرستی نہیں تو کیا ہے؟ کسی گھر کو اللہ کا خاص ماننا۔ اس کے گرد طواف کرنا۔ پتھر کو بوسہ دینا۔ یہ عجیب توحید ہے۔ نذر پر جلالین نے لکھا ہے۔

یعنی قربانی اور ہدی کا جانور جس کے ذبح کرنے کی نذر کی ہے۔ اس کو ذبح کریں۔

غریب جانوروں نے نہ جانے کیا گناہ کیا ہے۔ ان پر تو فرمایا ہے۔

لَکُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ

(سورہ حج - رکوع ۴)

تم کو چوپایوں میں فائدے ہیں ایک ٹھیرے وعدے تک - پھر اُن کو پہنچنا اسی قدیم گھر میں - (جلالین)

حاشیہ پر لکھا ہے -

پھر اُن کے ذبح ہونے کی جگہ بیت اللہ کے پاس ہے -

جانور کا ذبح کرنا بھی کوئی عبادت کا حصہ ہے ؟ اہل اسلام کا عقیدہ ہے - کہ اللہ کی راہ میں مرنے سے جانور کی زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے - ہم حیران ہیں کہ اللہ نے تو انہیں زندگی بخشی ہے - اور تم اُسے اس سے محروم کرتے ہو - اور پھر کہتے ہو - کہ اللہ کا منشا پورا کرتے ہیں - یہی منشا تھا - تو پیدا کیوں کیا ؟ مذبح اور بیت اللہ !

سورہ جن میں کہا ہے -

اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (جن - ۱۸)

تحقیق مسجدیں اللہ کے لئے ہیں - پس مت پکارو ساتھ اللہ کے کسی کو -

مگر یہاں پکارنا تو ساتھ اللہ کے رسول کا بھی بنا ہوا ہے - اس پر مفصل بحث ہم شرک کے باب میں کر چکے ہیں - اللہ کے لئے ایک گھر تو خاص کیا ہی تھا - اب ہر مسجد اللہ کے لئے مخصوص کر دی - اگر اللہ کے گھر کے معنی یہ ہوتے - کہ وہ خالق عالمین کی ملک ہے - جو شخص چاہے - اس میں آرام پائے - تو حرج نہ تھا - مگر یہاں تو غیر مسلموں کو

اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ

تحقیق مشرک پلید ہیں - پس نہ قریب ہوں مسجد الحرام کے

نجس کہہ کر ان کے نزدیک جانے سے بھی منع کر دیا ہے - یہی نہیں جہاں ایک دفعہ مسجد بن گئی - وہ زمین اب کسی اور کام نہ آئیگی - چاہے راستے میں ہی کسی ان پڑھ نے بے ڈھب سی چار دیواری کھینچ دی ہو - اور اس میں محراب بنا دی ہو - وہ ہٹائی نہ جا سکیگی - کیونکہ اللہ کی ہے لوگوں کو اپنی عمارتوں کے مقابلے میں انچ انچ پر لڑتا دیکھا ہے - یہاں وہی حالت اللہ میاں کی ہو رہی ہے - ہمسائے کا گھر خراب ہوتا ہے - ہو - کسی سڑک کی توسیع میں رکاوٹ آتی ہو - آئے - اللہ میاں کا گھر اللہ میاں کی مخلوق کا گھر نہیں بن سکتا - یہ صاف تنگ پرستی نہیں تو کیا ہے؟
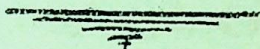
قرآن میں عورت کا درجہ

دُنیا کی آبادی کا نصف عورتیں ہیں۔ اور کسی مذہب کا یہ دعوٰی۔ کہ وہ تمام بنی نوع انسان کے افادہ کے لئے آیا ہے۔ اس کسوٹی پر پرکھا جانا ضروری ہے۔ کہ وہ ملّت انسان کے اس نصف کو مجلسی۔ اخلاقی اور رُوحانی حقوق کیا دیتا ہے۔ قرآن میں رہبانیت منع ہے۔ بغیر شادی کے کوئی انسان نہیں رہ سکتا۔ نابالغ بچّہ تو ہوتا ہی والدین کے ہاتھ کا کھلونا ہے۔ بالغ ہونے پر مسلمان عورتوں کو ایک حکم یہ ہے۔ کہ

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (احزاب - ۳۲)

اور ٹھیری رہو اپنے گھروں میں

یہی وہ آیت ہے۔ جس کی بُنیاد پر پردہ کھڑا کیا گیا ہے۔ اس سے جسمانی۔ ذہنی۔ اخلاقی اور رُوحانی سب طرح کے نقصان ہوتے ہیں۔ اور ہوئے ہیں۔ خود اسلامی ممالک میں اس رواج کے خلاف سخت احتجاج کیا جا رہا ہے۔ قانون بن رہے ہیں۔ جس سے پردے کو غیر ضروری ہی نہیں ناجائز قرار دیا جا رہا ہے۔ پردہ اس بات کا مظہر ہے۔ کہ عورت اپنا خود مختار وجود نہیں رکھتی۔ وہ آزاد رہ ہی نہیں سکتی۔ شادی سے پہلے اور بعد دونوں صورتوں میں پردے کی قید قائم رہتی ہے۔

اسلام میں شادی کا رشتہ قابل تنسیخ ہے۔ مگر جہاں خاوند جب چاہے، طلاق دے سکتا ہے۔ اور اسے کسی عدالت میں جانے کی ضرورت

نہیں - وہاں عورت کو عدالت میں ثابت کرنا ہوتا ہے - کہ اسے طلاق دیا جانا ضروری ہے - عورت اور عدالت ! طلاق دیتے ہوئے مرد پر لازم فقط یہ ہے - کہ حق مہر ادا کر دے - اس کا نام ہے قرآن کی اصطلاح میں اُجُوْرَھُنَّ - کہا ہے -

فَما استمتعتم بہٖ منھن فاٰتوھن اجورھن فریضۃ

اور جن سے تم تمتع کرو - انہیں دے دو اُن کا حق مہر مقرر

شادی روپوں پیسوں کا رشتہ نہیں - یہ دو جسموں ہی کی نہیں - دو دلوں کی گانٹھ ہے - جس کی جسمانی صورت اولاد - پرماتما کی پاکیزہ مخلوق ہے - اور رُوحانی صُورت دو روحوں کی دو جسموں میں یکجانی ہے - اتنا ہی اچھا ہے - کہ ایک حدیث میں فرمایا ہے - کہ خدا کسی بات سے اتنا ناراض نہیں ہوتا - جتنا طلاق سے -

اولاد ہو جانے پر کسی نے طلاق دے دیا تو ؟ فرمایا ہے -

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَۃَ ؕ وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَہٗ رِزْقُھُنَّ وَکِسْوَتُھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (سورہ بقر - آیت ۲۳۳)

اور مائیں دودھ پلائیں اولاد اپنی کو دو برس پورے - اگر وہ (باپ) چاہے پورا کرنا دُودھ پلانے کا عرصہ - اور باپ پر ہے ان کا کھلانا پلانا اور پوشاک موافق دستور کے -

ماں کا رشتہ اولاد سے اتنا ہی ہے - اس سے بڑھ کر وہ ان کی کیا لگتی ہے ؟

پھر کثرت ازدواج کی اجازت ہے - کہا ہے -

فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ط

(سورہ نسار۔ آیت ۳)

پس نکاح کرو اُن سے جو تمہیں اچھی لگیں عورتیں ۔ دو۔ تین یا چار۔ پس اگر ڈرو کہ عدل نہ کر سکوگے ۔ پس ایک کرو یا وہ جو ملک ہیں تمہارے داہنے ہاتھ کی ۔ یہ زیادہ اچھا ہے ۔ تاکہ تم مناسب راستے سے نہ پھرو کثرت ازدواج پر عدل شرط ہے ۔ پھر کہا ہے ۔

وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ۔

(سورہ نسار۔ آیت ۱۲۹)

اور تم نہیں کر سکتے عدل عورتوں میں چاہے تم حرص کرو ۔

ایسی صورت میں تو اہلِ اسلام کو ایک سے زیادہ نکاح کرنے ہی نہ چاہئیں لیکن ہو رہے ہیں ۔ اور ان کا خمیازہ بھی اُٹھایا جا رہا ہے ۔ اس ھیر پھار سے منع کرنے کی نسبت سیدھا منع کرنا زیادہ اچھا ہوتا ۔ بات یہ ہے کہ قرآن نے "عدل بین النسا" "عورتوں میں عدل" پر تو اصرار کیا ہے ۔ لیکن "عدل بین الجنسین" دونوں جنسوں ۔ ذکور واناث ۔ میں عدل کو نصب العین نہیں بنایا ۔ 'عورتوں میں عدل' کے تو معنے یہ ہیں ۔ کہ مرد حاکم ہے اور عورتیں اس کی کچہری میں فریق ۔ چاہئے تھا مرد اور عورت کو باہم فریق بنانا ۔ جیسے مرد کو یہ پسند نہیں کہ اس کی دوسری عورت ہو ۔ ویسے ہی عورت بھی سوکن کے ڈاہ سے جلتی ہے ۔ عدل یہ ہے ۔ کہ دونوں کو ایک ہی شادی پر قانع کیا جائے ۔ اور پھر" داہنے ہاتھوں کی ملکیت ' جس کے معنے سب مفسروں نے

باندیاں کیے ہیں۔ اس " عدل بین الجنسین " کا عین اُلٹ ہیں۔ یہ جائز کسی اخلاق کے ضابطہ میں جائز نہیں ہو سکتی۔

شیعوں کے نزدیک متعہ بھی جائز ہے۔ جو آیت ہم اُوپر حق مہر دیئے جانے کے متعلق بطور سند درج کر چکے ہیں شیعہ اسی آیت سے متعہ کا جواز اخذ کرتے ہیں۔ اہل سُنت بھی مانتے ہیں۔ کہ حضرت محمد کے حین حیات میں کچھ مدت متعہ جائز رہا۔ بعد میں ممنوع ہوا۔ اور متعہ کے معنی ہیں عارضی شادی۔ جس کا رواج اب تک ایران میں پایا جاتا ہے۔ شادی اور عارضی!

پھر اس پر حلالہ ہے۔ کہا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۔ ۔ ۔ ۔ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا

(سورہ بقر۔ آیات ۲۲۹-۲۳۰)

طلاق دو دفعہ دیا جا سکتا ہے۔۔۔ پس اگر (تیسری بار) طلاق دے دے اسے تو وہ حلال نہیں اُسے اس کے بعد۔ حتیٰ کہ وہ نکاح کرے غیر مرد سے۔ پس وہ اُسے طلاق دے۔ بس پھر عیب نہیں۔

تیسرے نکاح پر کہا ہے۔

نکاح نہیں بندھ سکتا۔ جب تک بیچ میں دوسرے خاوند کی صحبت نہ ہو چکے۔ (موضح القرآن)

اس حلالہ پر تعداد کی قید نہیں جتنی دفعہ تیسرا طلاق دیا جائیگا۔ اتنی دفعہ سابق خاوند سے نکاح کرنے کے لیئے حلالہ لازم ہوگا۔ یہ قانون کی نہایت بڑی خامی ہے۔ اس کے منطقی جبلسی نتائج کا تصور کر کے بھی ناظر تھرّا اُٹھیگا +

حلال و حرام

قرآن میں کچھ آئتیں کھانے پینے کے متعلق بھی آئی ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ج (سورہ بقر۔ آیت ۱۷۴)

تحقیق حرام کیا گیا تم پر مُردار۔ اور لہو اور گوشت سُؤر کا اور وہ جس پر بغیر اللہ کے کچھ پکارا جائے۔

اہلِ اسلام 'میتتہ' کے معنے لیتے ہیں۔ جو خود مر جائے۔ لفظی معنے تو ہیں "جو مر گیا ہو" اور اس پر اللہ کا نام لینے کے معنے ہیں۔ ذبح کرتے ہوئے "اللہ اکبر" اور "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھنا۔ اِدھر رحیم اور رحمٰن اللہ کا نام لینا۔ اُدھر بے زبان کے گلے پر چھری پھیرنا۔ کچھ تو کلام اور محل کا تطابق چاہیئے۔

سورہ مائدہ میں آیا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ۔ (سورہ مائدہ۔ ع۔ ۱)

حرام کیا گیا تم پر مُردار۔ اور لہو اور گوشت سُؤر کا اور جس پر سوائے اللہ کے اور کچھ پڑھا جائے اور جو مر گیا گھٹ کر اور جو لاٹھی یا پتھر

کی ضرب سے - اور جو گر کر - اور جو سینگ مارنے سے - اور جس کو کھایا
ہو درندوں نے -

اگر یہ مرے ہوئے تازہ مل جائیں - تو ان میں اور اپنے ہاتھ کے
مارے میں فرق کیا ہے ؟ سوائے اس کے کہ ان پر رحیم پرماتما کا
نام لے کر چھری نہیں چلائی -

حرام تو اور بھی کئی چیزیں ہیں - مثلاً انسان کا گوشت - درندوں کا
گوشت وغیرہ وغیرہ - لیکن ان کا ذکر قرآن میں نہیں آیا - درندوں کے
گوشت کی حرمت کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے - کہ اس سے کھانے
والے میں درندوں کی سی صفات آتی ہیں - نادر بیگ مرزا نے اس
پر خوب سوال کیا ہے - کہ ان درندوں میں یہ صفات کیسے آئیں ؟
گوشت کھانے ہی سے تو - ہم ناحق درندہ بنے بھی جاتے ہیں - اور کہتے
بھی ہیں کہ درندوں کی خصائل سے بچنا چاہئے - خیر یہ ہیں بعد کی تاویلیں -
کیا یہ الہامی کتاب کا نقص نہیں - کہ اس میں حرام چیزوں کی فہرست نہایت
نامکمل دی ہے جسے قرآن کے کامل الہام ہونے کا اعتبار ہو - وہ کیا
ان ممنوع اشیا کے سوا اور سب چیزیں حلال سمجھے ؟

روزہ بھی کھانے پینے سے تعلق رکھتا ہے - اس کا مختصر ذکر بھی
یہاں کر دینا نامناسب نہ ہو گا - فرمایا ہے -

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (بقر - آیت ۱۸۳)

اے جو ایمان لائے ہو - مقرر کیا جاتا ہے تمہارے لئے روزہ جیسے مقرر
کیا گیا تھا ان کے لئے جو تم سے پہلے تھے - شاید تم پرہیزگار رہو -

روزے کا ایک فائدہ تو جسمانی ہے۔ کہ کبھی کبھی معدے کو خالی رکھنے سے ہاضمے کے اعضا کچھ وقت تعطیل پاکر اپنے کام کے لئے زیادہ مستعد ہو جاتے ہیں۔ علاوہ اس کے مرتاض لوگ اپنے حواس پر قابو پانے کے لئے بھی روزہ رکھ لیتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیت میں "لعلکم تتقون" کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ قرآن کا کوئی نیا فرمان نہ تھا۔ بلکہ جیسے اِس آیت میں صاف بیان کیا ہے۔ اس سے پہلے مذاہب میں بھی روزے کا حکم تھا۔ مثلاً ہندو مختلف قسم کے برت رکھتے تھے۔ ایک برت ایک مہینے کا ہوتا تھا۔ جس کا نام چاندرائن برت تھا۔ اس میں آہستہ آہستہ کھانا بڑھاتے اور گھٹاتے تھے۔ دن میں ایک بار تھوڑا سا کھاکر باقی وقت بھوکے رہتے تھے۔ دوسری قوموں نے اِس برت میں کچھ کچھ ترمیم کر لی۔ پرہیزگاری کے مقاصد کے لئے شہوانی جذبات پر غالب رہنے کی ہدایت تھی۔ چنانچہ مجامعت منع تھی۔ ریاضت۔ اس کے لئے روزہ اور پھر مجامعت؟ یہ تو اجتماع ضدین ہے۔ کھانے کی بھی حد تھی۔ کہ ہلکی اور تھوڑی غذا پر صبر کیا جائے شروع شروع میں اہل اسلام میں بھی یہی دستور تھا۔ مگر مسلمانوں میں بے اعتدالی کا زور دیکھ کر یہ آیت نازل ہوئی۔

اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ ط ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ ط عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْھُنَّ وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ط (بقر۔ ۱۸۴)

حلال کی گئی تمہارے واسطے رات روزے کی کہ رغبت کرو اپنی بیویوں سے۔ وے تمہارے واسطے پردہ ہیں اور تم ان کے واسطے پردہ ہو۔ اللہ نے جانا کہ تم خیانت کرتے ہو اپنے آپ سے۔ پس وہ پھرا تمہاری طرف اور معاف کیا تم کو۔ پس اب مباشرت کرو۔ اور چاہو جو مقرر کیا اللہ نے تمہارے لئے۔ کھاؤ اور پیو حتیٰ کہ ظاہر ہو۔ تمہارے لئے سفید دھاگا کالے دھاگے سے صبح ہونے پر۔

موضح القرآن میں لکھا ہے۔

اس بیچ میں بعض شخص نہ رہ سکے۔ پھر حضرت کے پاس عرض کیا۔ یہ آیت اُتری۔

ایسے روزے سے جس میں ساری رات کھانے پینے کی چھٹی ہو۔ اور نفسانی جذبات پر اتنا بھی ضبط نہ ہو۔ کہ چلو۔ یہی ایک مہینہ سہی مجرد رہیں۔ نہ کوئی جسمانی فائدہ متصور ہے نہ روحانی ✠

اللہ میاں کی قسمیں

قرآن میں قسمیں کھانا منع ہے۔ چنانچہ کہا ہے۔

قل لا تقسموا ۔ (نور۔ ع۔ ۷)

کہہ۔ قسمیں مت کھاؤ۔

مگر خود اللہ میاں جا بجا قسمیں کھاتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

تا اللہ لقد ارسلنا (نحل۔ آیت ۵۹)

قسم ہے اللہ کی بھیجے ہم نے پیغمبر۔

قطع نظر اس سے کہ قسم کھانی چاہئے یا نہیں۔ کیا یہ کلام اللہ کا معلوم ہوتا ہے؟ اللہ تو اپنے آپ کو ہم کہہ رہا ہے۔ مگر قسم کھاتے ہوئے کہتا ہے۔ اللہ میاں کی قسم۔ صاف ہے کہ "ہم" کوئی اور ہے۔ اور اللہ میاں کوئی اور۔

والقرآن الحکیم

قسم ہے قرآن حکیم کی

فلا اقسم بمواقع النجوم (واقعہ۔ ۷۵)

پس قسم کھاتا ہوں میں گرنے والے تاروں کی۔

والسماء ذات البروج (بروج۔ آیت ۱)

اور قسم ہے آسمان برجوں والے کی۔

قرآن میں اس قسم کی قسموں کی بھرمار ہے۔ یہ قسمیں کیا ہیں؟

اینٹ کی قسم اور پتھر کی قسم۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی قسم۔ کچھ بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ ہے الہام کا حصہ! کوئی معمولی آدمی بات بات میں قسم کھائے۔ تو کہتے ہیں۔ اسے اپنے پر اعتبار نہیں۔ مگر اللہ میاں کو کوئی کیا کہے؟ بڑے آدمیوں کو عدالت بھی قسم سے مستثنیٰ کر دیتی ہے۔ مگر یہاں تو عدالت کی مجبوری بھی نہیں۔ کہ قانون کے ضابطے کی بندش ہو۔ اور اس کی پابندی سے بچ نہ سکیں — ہوگی کوئی بات!

کہیں اس بے ضرورت سوگند خوری کا نام ہی تو فصاحت نہیں۔ اہل اسلام کا دعویٰ ہے۔ کہ قرآن جیسا اور فصیح کلام نہیں؟
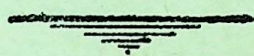
ماں باپ سے برتاؤ

جب کوئی شخص نیا مذہب قبول کرتا ہے۔ جو اس کے والدین کے عقیدے سے مختلف ہو۔ تو اسے اپنے گھربار کے متعلق اپنے آئندہ رویہ کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ کیا وہ اب بھی والدین کی خوشنودی کا پابند ہے۔ یا آزاد ہے کہ جو چاہے مانے اور جو چاہے کرے۔ جسم کی پیدائش اور نشو و نما والدین کے طفیل ہوئی ہے۔ انہوں نے پالنے پوسنے اور تعلیم و تربیت دینے میں بے انداز زحمتیں سہی ہیں۔ انہیں ٹکا سا جواب دے دینا اقتضائے اخلاق کے بالکل برخلاف ہے۔ قرآن کی ہدایت اس بارے میں بہت خوب ہے۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ط وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ط (عنکبوت - ۱)

اور حکم کیا ہم نے انسان کو والدین سے بھلائی کا۔ اور اگر جھگڑا کریں تجھ سے یہ کہ شریک لاوے تو ساتھ میرے اس چیز کو جس کا تجھے علم نہیں۔ تو مت کہا مان اُن کا۔

شرک والدین کے حکم سے بھی نہ کرنا چاہئے۔ آریہ شاستروں میں لکھا ہے۔ کوئی بھائی بزرگوں کے کہنے سے نہیں کرنی چاہئے۔ والدین کا حکم اسی وقت تک قابل تعمیل ہے۔ جب وہ شاستر کے مطابق ہو۔ قرآن نے شرک کے متعلق استثنا کر دی ہے باقی ذمیم اخلاق اور غلط اعتقادات

کی بھی اسی طرح استغنا کر دیتے - تو حکم پورا ہو جاتا - اور آریہ شاستروں کے نزدیک آجاتا -

ایک اور جگہ کہا ہے -

وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوفًا ز (لقمان - آیت ۱۵)

اور ساتھ دو ان کا دُنیا میں حسب دستور

مقدم الذکر حکم میں غیر مکمل ہونے کا نقص تو تھا ہی - مگر اہل اسلام اس کی اتنی بھی تعمیل نہیں کرتے - جتنی اس آیت میں فرض کی ہے - والد مشرک بھی ہو - تو شرک کے معاملے کو چھوڑ کر باقی جائز معاملات میں اس کی رفاقت کرنی ہی چاہیئے - مگر یہاں تو اسے جہنمی سمجھ کر قطعاً ترک تعلق کیا جاتا ہے - شاید اس کی وجہ یہ آیت ہو -

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا اٰبَاءَکُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَاءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ ط (توبہ - آیت ۲۱)

اے جو ایمان لائے - مت پکڑو باپوں اپنے اور بھائیوں اپنے کو دوست اگر وہ عزیز رکھیں کفر کو اوپر ایمان کے -

ایمان ذہن کا معاملہ ہے - اگر اس میں والدین کا دیانتدارانہ اعتقاد اولاد سے مختلف ہے - تو انہیں دوست نہ رکھنا مجلسی ذمہ داری کے بنیادی اصولوں کا خون کرنا ہے - والدین کا ناجائز حکم نہ مانا جائے یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن فقط اس لئے کہ وہ کفر کو دیانتداری سے اسلام پر ترجیح دیتے ہیں - کافر ہونیکے لئے کہتے بھی نہیں - ان کی خدمت نہ کرنا - ان سے بیدلی کا اظہار کرنا ظلم ہے - یہی صورت بھائیوں کی ہے - وہ دھرم سے منع کریں - تو مت ان کو - دھرم کی ترغیب دیں - تو مت مانو - لیکن ایک مذہبی عقیدے میں اختلاف ہونے پر اپنے خون کو ٹھنڈا کر لو - ان سے آنکھ چرا لو - اپنا بھائی نہ سمجھو - اخلاقاً ضرور قابل گرفت ہے

"حق پرکاش" پر ایک نظر

ستیارتھ پرکاش کے چودھویں سملاس کے جواب میں تا حال فقط مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے "حق پرکاش" نام کا ایک رسالہ لکھا ہے۔ مولانا اہل حدیث ہیں۔ وہ نہ تو تمام فرقہ ہائے اسلام کے قائم مقام ہو سکتے ہیں۔ نہ ان کی تعبیر قرآن کو کوئی ایک جماعت اسلام بھی مقبولیت کا شرف عطا کرتی ہے۔ اس لئے اگر آریہ سماج نے ان کی کتاب سے استغنا برتا ہے۔ تو جائے تعجب نہیں۔ تاہم اپنی شخصی حیثیت سے ہی۔ حضرت مولانا کا رسالہ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے اس باب کی جیسی بھی ہو۔ جانچ ہے۔ پرکھ ہے۔

مولانا سن رسیدہ بزرگ ہیں۔ ہم نے آریہ پنڈتوں کے ساتھ آپ کے مباحثے سنے ہیں۔ اور ہمارے دل میں آپ کے لئے وہی تعظیم کا جذبہ ہے۔ جو سن رسیدہ آریہ پنڈتوں کے لئے۔ ہم ہندوستانی دیہات کی اس تہذیب کے وارث ہیں۔ جس میں بڑی عمر کا نوکر بھی چاچا کہلاتا ہے۔ پھر مولانا تو ہمارے بڑے بوڑھوں کے ساتھ ایک ہی پلیٹ فارم پر کھڑے ہوتے رہے۔ آپ ہمارے بزرگوں کے ہم جلیس۔ دوسرے لفظوں میں بالالتزام بزرگ ہیں۔

کئی بار ہمیں آپ کی کتاب کا جواب دینے کو کہا گیا۔ لیکن ہمارا جواب ہمیشہ یہی رہا۔ کہ یہ کام مولانا کے اپنے ہم عمر دل کا تھا۔ ہم نوجوان اس

سفید ریش کے مقابلے میں قلم چلائیں۔ کچھ مذاق کی سی بات ہوگی۔ مولانا نے اپنی کتاب کا دیباچہ ختم کرتے ہوئے لکھا ہے۔

حق پرکاش کے جواب کا حوصلہ نہ ہونا کیا وجہ رکھتا ہے؟ یہی کہ ان (آریہ سماجیوں) کا علم بھی اس بات کا فیصلہ کر چکا ہے۔ کہ سوامی دیانند کے اعتراضات پشتیبانی سے مضبوط نہیں ہو سکتے؟

مولانا! ہمارے راستے میں یہ وجہ حائل نہیں۔ ہمارے راستے میں حائل ہے آپ کی تعظیم۔ کاش کہ آپ نے بھی اپنی کتاب میں اسی حفظ آداب کا لحاظ رکھا ہوتا۔ پہلے ہی صفحہ پر آپ نے فرمایا ہے۔

ہم ان کے گرو کو عزت سے یاد کریں گے۔ کیونکہ اسلام کا ہم کو یہی حکم ہے۔

دیکھیں۔ آپ اس حکم کی تعمیل کس حد تک کرتے ہیں؟ دوسرے ہی صفحہ پر آپ نے ہندوؤں سے "سوامی جی کی تیز زبانی اور نافہمی" کی شکایت منسوب کر کے اس پر صاد کیا ہے۔ صفحہ ۴ پر سوامی درشنانند آنجہانی کے متعلق یہ لکھ کر کہ "درشت گوئی۔ دلآزاری جو بہت آریوں کی عادت ہے۔ ان میں نہ تھی۔" فرمایا ہے۔ "ایک قدم چل کر ایسے گرے۔ کہ دنیا سے کوچ کرنے تک ادھر رخ نہ کیا۔" سچ کہنا۔ یہ تعظیم ہے؟ شاید آپ کو حکم فقط مذہبی پیشواؤں کو عزت سے یاد کرنے کا ہو۔ مگر آپ کی ساری کتاب رشی دیانند کی اہانت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ رشی دیانند کی تصانیف میں طرفدار اور متعصب لوگوں کو واجب طور پر جماعتاً تلخ تنبیہہ و توبیخ کی ہے۔ اس توبیخ کی مخاطب ایک نوع ہے۔ کوئی فرد نہیں۔ اس طرح کی توبیخ سے ہر ذی شعور شخص متفق ہوگا۔ مگر

مولانا نے جگہ جگہ پر زورا زوری سے ان الفاظ کا اطلاق رشی کی شان میں کر دیا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۷ پر ستیارتھ پرکاش کا مندرجہ ذیل اقتباس دے کر

اس سے بڑھ کر جھوٹا مذہب اور کون ہو سکتا ہے۔

کہا ہے۔

پس سوامی جی مہاراج اور اُن کے چیلوں کے لئے اتنا کافی ہے۔ کہ قرآن شریف کے ماننے والے کروڑہا آدمی ہیں۔ پھر جو تم اس کی تعلیم کو جھوٹا اور غلط کہو۔ تو تم سے زیادہ ۔ ۔ ۔ کون ہے؟

مولانا! رشی یا اُن کے چیلوں نے کبھی قرآن کی تمام تعلیم کو جھوٹا نہیں کہا۔ رشی فرماتے ہیں۔

میں پُران۔ جینیوں کی کتابوں۔ بائیبل اور قرآن کو پہلے ہی بُری نظر سے نہ دیکھ کر ان کی خوبی کو تسلیم اور نقصوں کو ترک کرتا ہوں۔

رشی جھوٹا اسے کہتے ہیں۔ جو کسی مذہب کو سراسر جھوٹ کہے۔ اس پر کون سلیم الطبع صاد نہ کہے گا؟

مولانا کی کچھ گوہر افشانیاں تو اسی اقتباسی ڈھنگ کی ہیں اور کچھ اپنی ذاتی ایجاد ہیں۔ ہم دونوں طرح کے نمونوں کا اندراج نیچے کئے دیتے ہیں۔

محقق جی (رشی دیانند) کے بھولے بھالے بچوں کے سے سوال سُن کر بے اختیار ہنسی آتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

مبت بھی خدائی کرتے ہیں قدرت خدا کی ہے

افسوس ایسے بھولے پن پر جو ہر گھڑی ذلت کا موجب ہو۔ (صفحہ ۲۸۱)

اسی جواب میں شیطانی باتوں کا جواب بھی ملیگا (صفحہ ۲۸)

اگر قرآنی اور پرانی اپنے اپنے قول سے بہشتی ہیں۔ آپ تو دونوں کے قول سے دوزخی ہیں۔ (صفحہ ۲۹)

سچ ہے۔ کچھ لوگ ایسے ضدّی ہوتے ہیں۔ کہ وہ متکلّم کے خلاف منشا تاویل کرتے ہیں۔ ان کی عقل تاریکی میں پھنس کر زائل ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۴۴)

جو وید (یا قرآن) بغیر استاد کے پڑھتا ہے۔ چور ہے (صفحہ ۵۶)

سوامی جی کو انصاف یا فہم سے کوئی مطلب نہ تھا۔ (صفحہ ۵۶-۵۷)

جس کا ترجمہ سوامی جی نے کسی بڑھیا سے سن کر یوں کر دیا (صفحہ ۶۶)

ناپاک باطن والے جاہلوں کو واقعی علم نہیں ہوتا (صفحہ ۶۷)

آپ سمجھ اور دیانت سے کام نہ لیتے تھے (صفحہ ۸۰)

نہ محقق بود نہ دانشمند۔ چارپائے بر او کتابے چند (صفحہ ۸۳)

پنڈت جی (رشی دیانند) کو اعتراض بڑھانے کا ایسا شوق چرا ہوا ہے۔ کہ ایک ہی اعتراض کو کئی ایک مواقع پر کرکے مورکھوں میں نمبر شماری کراتے ہیں۔ (صفحہ ۸۷)

نیش عقرب نہ از پئے کین است مقتضائے طبیعتش این است (صفحہ ۹۷)

مشرکوں کی اولاد بلکہ خود مشرک ہو کر بھی شرک سے ڈریں (صفحہ ۹۶)

بڑا ہی پاپی ہے وہ شخص جس کا اپنا گھر شیشے کا ہو۔ اور دوسروں پر پتھر برسائے۔ (صفحہ ۹۸)

سوامی جی! آپ نے بڑی غلطی کھائی۔ کہ میدان مناظرہ کو سماج منڈل

سمجھ گئے۔ کہ جس طرح اناپ شناپ سماج میں کہہ دینے پر کوئی پوچھ نہیں سکتا۔ اسی طرح مناظرہ میں بھی نہ ہوگی۔ مگر یہ کبھی نہ سُنا تھا کہ

سنبھل کر پاؤں رکھنا میکدے میں سرستی صاحب
یہاں پگڑی اُچھلتی ہے اسے مے خانہ کہتے ہیں

اس شعر کے بعد کسی کو عزت سے یاد کرنے کا دعویٰ معلوم! امیخانہ کی بولی اس سے اچھی کیا ہو؟

سماجیو! آؤ۔ ہم تمہیں سوامی جی کی بے سمجھی یا دروغ گوئی بتلا دیں۔ (صفحہ ۱۰۳)

ایسے ناپاک باطن والے جاہلوں کو واقعی علم نہیں ہوتا۔ (صفحہ ۱۰۸)

آپ مسیلمہ کذاب سے بھی بڑھ کر مدعی نبوت ہوتے (صفحہ ۱۱۰)

آپ کے بھائی بند کفار عرب۔ (صفحہ ۱۱۰)

چوا چوری سے جائے۔ ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ (صفحہ ۱۱۹)

اگر کسی مولوی صاحب کے پاس تھوڑی مدت بیٹھ کر قرآن شریف پڑھ یا سُن لیتے۔ تو ایسے دھکے نہ کھاتے۔ (صفحہ ۱۲۴)

کیئے عقل بڑی یا بھینس؟ (صفحہ ۱۲۶)

لطف پر لطف ہے اہلا ہیں میرے یار کے یار
جاتے حطی سے گدخ لکھتا ہے ہوز سے ہمار (صفحہ ۱۳۰)

متکلم کے خلاف منشا مخالف مراد معنی لے کر عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ (صفحہ ۱۳۲)

پنڈت مصر مشالچی سارے اگو ریچ ادروں کریں اوجالا آپ اندھیرے وچ (صفحہ ۱۳۷)

یہ بچوں کی سی باتیں چھوڑ دیں ۔ (صفحہ ۱۴۰)
یہ منہ اور مسور کی دال (صفحہ ۱۴۰)
دن میں نابینا کو نظر نہ آنے سے دن کا قصور ثابت نہیں ہوتا (صفحہ ۱۶۳)
کہیں آپ وہی سادھو تو نہیں جو بالائی سمیت پیا کرتے ہیں (صفحہ ۱۶۴)
سوامی جی کو تو پانی بلونے کی عادت ہے ۔ (صفحہ ۱۷۹)
ہائے ایسی سمجھ پر پتھر جو اتنا بھی نہیں جانتا ۔ (صفحہ ۱۷۹)
سوامی جی تعصب اور ضد میں آئے ہوئے نظام عالم پر بھی غور نہیں کرتے (صفحہ ۱۸۳)

کیسا پاپی اور بے حیا ہے وہ شخص جو ضد اور نفسانیت سے سوال کرے ۔ (صفحہ ۱۸۵)
یوگی اور سادھو ہو کر ایسا مغالطہ اور فریب دہی ؟ (صفحہ ۱۹۲)
یہ تو دیوانوں کی بڑ کے برابر ہے (صفحہ ۱۹۹)
آپ جیسے دشمن کو بھی، باوجود عیسائیوں کی کاسہ لیسی کے (صفحہ ۱۹۷)
دیکھو پاگلانہ بڑ ۔ (صفحہ ۲۰۰)
پنڈت جی کے اس لٹھ مار سوال سے (صفحہ ۲۰۹)
آگے اپنی ٹیک بندی بلالیں ۔ (صفحہ ۲۱۲)
سارا سادھو پن گنگا میں ڈبو کر ننگے ہو بیٹھیں اور آئیں بائیں شائیں مارنی شروع کردیں ۔ (صفحہ ۲۲۲)
سماجیو! اگر آزمانا چاہو تو کپڑے کا ایک گولہ بناؤ ۔ اور لوہے کی میخ میں باندھ کر چھت سے لٹکا دو ۔ اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا دو ۔ اور ستیارتھ پرکاش کو ہاتھ میں لئے رہو ۔ جب اس کے جلنے سے چاروں

طرف اُوپر اور نیچے تمام روشنی ہو - تو جو کچھ اس وقت ہاتھ میں لئے
ہو - اس میں جھونک دو - (صفحہ ۲۲۴)
ہمند دزادہ ہو کر ایسی نفرت غنیمت ہے - (صفحہ ۲۲۵)
آج معلوم ہُوا - کہ سوامی جی تجرّد میں کیسی گزار نے سُننے (صفحہ ۲۲۷)
پنڈت، ! (صفحہ ۲۲۷)
چونکہ ستیارتھ پرکاش کے بننے سے شیطان بیکار رہے - (صفحہ ۲۲۸)
پڑیئے نہ لکھے - تام محمد فاضل - (صفحہ ۲۳۱)
محقق ہذا (رشی دیانند) یعنی حقہ نوش - نہ تحقیق کنندہ - پرایکش پاپی -
متعصّب - دیانت سے خالی - علم سے بے بہرہ - اندرونی دہریہ - بظاہر
آریہ - دوسرے مذہبوں پر بیجا حملے کرنے والا - زبان دراز بظاہر سادہ ہو
خُفیہ کچھ اور - اِدھر اُدھر کی ملا کر مُورکھوں اور بے وقوفوں کو پھاندنے
والا - (صفحہ ۲۳۶)
عربی کی حرف شناسی سے جاہل محض اور قرآن کے رد کا ٹھیکہ - آنکھیں
چمگادڑ کی اور آفتاب سے جنگ و جدل - (صفحہ ۲۳۷)
مولانا کے تمسخر نے انہیں رشی دیانند کی تضحیک و تحقیر پر ہی قانع
نہیں رکھا - وید بھگوان سے بھی یہی سلوک کیا ہے - چنانچہ صفحہ ۱۷ پر ایک
وید منتر کا ترجمہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں -
ایسی خفگی - آغا - تلوار میان کُن -
گویا یہ پرماتما سے خطاب ہے ! اسی کے نیچے پھر ایک منتر کے ترجمہ
کے دوران میں لکھا ہے -
ہے مہاراج ! اتنی کھینگی ؟

میخانہ میں سب جائز ہے۔
صفحہ ۱۰۲ پر لکھا ہے۔
مہاراج! کچھ تو ہے؟
بڑے ناراج معلوم ہوتے ہیں (صفحہ ۱۵۷)
سوامی جی باراج! (صفحہ ۱۷۳)
ست بچن ماراج! (صفحہ ۲۰۵)
پھر ماتے ہیں۔ (صفحہ ۲۱۰)

بھلا کسی زبان کے الفاظ بگاڑ دینے میں بھی کوئی زندگی ہے؟ اور وہ اس حالت میں جب کہ آپ ایک قوم کے صحیفہ اقدس کا ذکر کر رہے ہیں۔ یا ایک نہایت مقدس ہستی کے متعلق زبان کشائی فرما رہے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

چڑھانے منہ لگے ہو دیتے دیتے گالیاں صاحب ۔ زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

صفحہ ۱۸۸ پر آپ نے چند شعر درج فرماتے ہیں۔ جو آپ نے کہیں بازار جاتے عشقبازوں کی زبان سے سن لئے ہیں۔ اس پیری میں یہ شعر خوانی بھی غنیمت ہے۔ خود فرمایا ہے۔

پیرے کردم زعشق زندگیں غنیمت است

ان اقتباسات کو پڑھ جانے کے بعد بھی کیا کسی کا منہ ہے۔ کہ آریہ سماجیوں سے اس کتاب کے جواب کا تقاضا کرے؟ مولانا کی ان پھکڑ بولوں کا جواب کیا ہے؟ یہی کہ ہمیں شاستروں نے حکم دیا ہے۔ کہ دوسروں کے بزرگوں کا نام عزت سے لو۔ پھر عزت ویسی ہی کر لو۔ جیسی مولانا نے کی ہے۔ ستیارتھ پرکاش کے اقتباسوں کا جواب قرآن شریف کے

اقتباسوں سے ہو سکتا ہے - ایسے اقوال قرآن میں بہت ہیں - جن میں غیر اسلامی فرقوں - ان کے معبودوں - ان کے عقیدوں - ان کے پیشواؤں سب کو نہایت دل آزارانہ پیرائے میں یاد کیا ہے[1] - پھر ان کا اطلاق کوئی کسی پر کر دے - اور شعر گوئی یا چست جملوں کی اوروں کے پاس بھی کمی نہیں - دقت ہے تو فقط یہ کہ دوسرے مذہبی مناظرہ گاہ کو مے خانہ نہیں سمجھتے -

ہم اہل اسلام سے فقط یہ تقاضا کریں گے - کہ وہ اقوام کے بزرگوں کے متعلق اپنا ایک رویہ بنا لیں - یا تو سب مذاہب کے بانی عام اشخاص میں سمجھے جائیں - اور ان کے ساتھ نقاد لوگ وہی سلوک کریں - جو دوسرے معمولی آدمیوں سے کرتے ہیں - یا انہیں تضحیک اور تحقیر سے بالاتر تسلیم کیا جائے - مگر یہ یاد رہے - کہ اس سلوک میں تخصیص کسی رنگ کی نہ ہوگی - جو حق حضرت محمد صاحب کا ہوگا - وہی رشی دیانند کا - وہی

---

[1] مثلاً - أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ (انبیا - ۶۷)

تف ہے تم کو اور اس چیز کو کہ عبادت کرتے ہو تم سوائے اللہ کے -

وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (انبیا - ۷۶)

جن کی عبادت کرتے ہیں سوائے اللہ کے پتھر ہیں جہنم کے -

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ (الحج - رکوع ۴)

پس بچو ناپاکی بتوں کی سے -

فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝ (بقر - آیت - ۸۲)

پس لعنت ہے اللہ کی کافروں پر -

گورو نانک صاحب کا تنقید ان سب کی ہوگی۔لیکن تعظیم کے پیرایہ میں ۔ رہا یہ کہ ان بزرگوں کے اپنے اقوال میں تنقید کے تمام طریقے برتے گئے ہیں۔ سو بھی سب کتب کا ایک سا حال ہے ۔چنانچہ قرآن کے متعلق مرزا غلام احمد صاحب ازالہ اوہام میں لکھتے ہیں۔

حالانکہ دشنام اور سب وشتم فقط اس مفہوم کا نام ہے۔جو خلاف واقعہ اور دروغ کے طور پر محض آزار رسانی کی غرض سے استعمال کیا جائے ۔اور اگر ہر ایک سخت اور آزار دہ تقریر کو محض بوجہ اس کی مرارت اور تلخ اور ایذا رسانی کے دشنام کے مفہوم میں داخل کر سکتے ہیں۔تو پھر اقرار کرنا پڑیگا۔کہ سارا قرآن شریف گالیوں سے پر ہے + (ازالہ اوہام)

اگر ان "گالیوں" کا جواب دینا جائز ہوگا۔تو سب کتابوں کی۔ اور تمام فرقوں کی طرف سے۔اور اگر ناجائز ہوگا۔تو بھی سب کتب کی۔ اور سب فرقوں کی طرف سے۔مولانا ثناءاللہ کا یہ لکھنا۔کہ "ہماری مدافعت ہے اور پنڈت جی کا حملہ" ان کی درشت کلامیوں کا بہانہ نہیں ہو سکتا۔ اگر اس دلیل کا سہارا لینا ہے۔تو کوئی آریہ سماجی یہ بھی کہہ سکتا ہے۔کہ "ستیارتھ پرکاش کی مدافعت ہے اور قرآن شریف کا حملہ"۔کیا آپ نے ویدک دھرمیوں کو مشرک نہیں کہا۔اور مشرکوں کو قرآن میں ملے لفظ نہیں سنائی گئی ؟

ہمیں خوشی ہے۔کہ حق پرکاش کا جواب کسی آریہ سماجی نے نہیں لکھا۔ لکھتا۔تو پھر اہل اسلام کو شکایت ہوتی۔کہ ہمارے مذہب کی توہین ہوئی ہے۔تماشا ہے۔توہین کی دعوت بھی خود دیتے ہیں۔اور جب کوئی قبول کرتا ہے۔تو احتجاج بھی زوروں سے کرتے ہیں۔مارنا بھی

اور نہ ونا بھی! یہ کہاں کی شجاعت ہے؟

رہیں مولانا کی دلائل۔ ان کی بنیاد اسلامی عقائد کی نئی تفسیر ہے۔ ہم نے کتاب ہذا میں ہر مضمون پر بحث کرتے ہوئے قرآن کی آیتوں کے ساتھ مستند تفاسیر کے حوالے بھی دے دئیے ہیں۔ جس سے اہل اسلام کے عقیدے کے متعلق شک نہ رہے۔ مولانا ان عقائد کو جواب دے بیٹھے ہیں۔ رشی دیانند کا روئے سخن مولانا سے نہ تھا۔ ان اہل اسلام سے تھا۔ جو تفاسیر اور روایات کو مانتے تھے۔ اس لئے رشی کے اعتراضات کا جواب بھی عقائد مستند اہل اسلام کی روشنی میں ہونا چاہیئے تھا۔ نہ کہ ان اعتراضات کے مطابق نئے اعتقادات وضع کرنے کے بعد ان نئے اسلامی عقائد کی آڑ میں۔ دبے الفاظ میں مولانا نے پرانے ترجموں اور تفسیروں سے اختلاف ظاہر بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ شاہ رفیع الدین کے ترجمے کے بارے میں لکھا ہے۔

بوجہ مغائرت محاورہ اردو اور عربی کے واضح مطلب خیز نہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا ہے۔

ہاں یہ بات قابل اظہار ہے۔ کہ سوامی جی کا منقولہ ترجمہ گو مترجمہ قرآن میں ہے۔ مگر ذرہ سی وضاحت یا اصلاح طلب ہے۔ (صفحہ ۲۲۳)

'ذرہ سی' اور 'وضاحت یا اصلاح طلب' مولانا کی اپنی اصطلاحیں اور ترکیبیں ہیں۔ غلط ہوں۔ تو اہل زبان اور ان کا معاملہ ہے۔

اونٹنی کا پتھر سے نکلنا جن لوگوں نے کہا ہے۔ ان کی رائے ہے۔ قرآن اس کا ذمہ دار نہیں۔ (صفحہ ۱۷۲)

حضرت! اگر اُونٹنی پتھر کی بجائے اپنی ماں کے پیٹ سے نکلی ہوتی۔ تو آیات الٰہی میں اس کا خاص شمار کیونکر ہوتا؟ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

مختصر یہ کہ قرآن شریف کے اصلی الفاظ اور ان کے ترجمہ پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جو ہوتا ہے وہ الگ باتوں پر ہوتا ہے۔
(صفحہ ۸۵)

یہ " اصطلاح طلب " ترجمہ اور " لوگوں ۔۔ کی رائے " اور " الگ باتیں " سوائے قرآن کے روایتی معنوں کے اور کچھ نہیں۔ آپ نے انہیں شرف قبول نہیں بخشا۔ کیا یہ رشی دیانند کا لوہا ماننا نہیں؟ کہہ دیجئے۔ کہ رشی کا اعتراض میرے لئے بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اب آپ نے اپنے شخصی اسلام کے نیچے سے اس کی بنیاد کھسکا دی۔ اس اسلام سے ہی منہ پھیر لیا جو اعتراض کا موجب تھا۔ لیکن یہ تو تسلیم کیجئے۔ کہ رشی کا وار تھا زبردست اور سچا۔ کہ اس نے آپ کے اعتقاد کی تمام تر عمارت گرا دی۔ آپ مستند مفسروں سے الگ جا کھڑے ہوئے۔ اور اب بھی کتنے اہل اسلام ہیں۔ جو آپ کی سُنتے ہیں؟

ہاں! یہ اور بات ہے کہ آپ اس نئے عقیدے کے وضع کرنے میں اپنے آگے پیچھے کے اقوال میں پورا تطابق نہیں رکھ سکے۔ اور کئی مقامات پر اجتماع ضدین کے مرتکب ہوئے ہیں۔ چنانچہ دُنیوی تکالیف کے بارے میں ایک جگہ تو فرمایا ہے۔

جو کچھ تم کو مصیبت پہنچتی ہے۔ تمہاری شامت اعمال ہے۔
(صفحہ ۲۱)

مگر ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

بے شک خدا اپنی مشیت سے ... جسے چاہے امیر کرے۔ اور جس کو چاہے۔ غریب کرے۔ ظلم تو تب ہو۔ کہ کسی کا اس پر حق ہو اور نہ دے۔ جب کوئی حق نہیں۔ تو پھر جس حالت میں اپنی حکمت کے تقاضا سے رکھے۔ اسی میں اس کا عدل اور اسی میں اس کا رحم ہے۔ (صفحہ ۱۲۶)

بھلا یہ دونوں قول ایک ساتھ کیسے درست ہو سکتے ہیں؟ مصیبت اعمال کا نتیجہ ہے تو اعمال اس سے پہلے ہونے چاہئیں۔ اور بعض مصیبتیں ایسی ہیں۔ جو ولادت کے ساتھ ساتھ نازل ہو جاتی ہیں۔ وہ کس عمل کا ثمر ہیں؟ تناسخ کے آپ قائل نہیں۔ پھر کس عمل کے ثمر ہیں؟ ہونو۔ مانا کسی عمل کا ثمر ہونگی۔ اگر ہر مصیبت عمل کا نتیجہ ہے تو پھر غریبی اور امیری کا میں مشیت (بغیر حق کے حکمت !) کو خواہ مخواہ دخل کیوں دیتے ہیں؟ لیجئے حضرت! آپ تو اپنے پہلے قول کے عین اُلٹا ارشاد فرمانے لگے۔ لکھا ہے۔

دنیا کی رنج و راحت کسی نیک اور بد کام کے عوض میں نہیں۔ نیکی بدی کا اصلی عوض دوسری زندگی پر ہے (صفحہ ۷۵)

تو جناب! ہر مصیبت شامت اعمال کیونکر ہوئی؟ اور جو یہاں بغیر اعمال کے مصیبت بخشتا ہے۔ کیا اعتبار کہ دوسری زندگی میں بھی اس کی یہ فطرت اس پر غالب نہ آجائیگی؟ وہ وعدہ ہے۔ یہ نقد۔

مشیت کی تعریف حضرت مولانا نے اوپر کر ہی دی ہے۔ لیجئے اس پر اور ارشاد ہوتا ہے۔

جو کچھ دُنیا میں ہوتا ہے ۔ خدا کی مشیت سے ہوتا ہے ۔ مشیت اس
کے قانون کا نام ہے ۔ بسا اوقات شاہی قانون پر عمل کرنے سے
رضا حاصل نہیں ہوتی ۔ ہندوستان میں سوراج کی تحریک گورنمنٹ
کے قانون کے ماتحت اور موافق ہے ۔ لیکن کیا گورنمنٹ راضی بھی ہے؟
(صفحہ ۷۹)

" بسا اوقات شاہی قانون پر عمل کرنے سے رضا حاصل نہیں ہوتی "!
شاہی قانون کے معنے یہاں خدائی قانون ہیں ۔ خدائی قانون پر عمل کرنے
سے رضا حاصل نہیں ہوتی! یہ نئی بات سُنی ہے ۔ یہ روایتی اسلام
کی بات نہیں ۔ تو حضرت! رضا کس سے ہوتی ہے؟ قانون توڑنے
سے؟ سوراج کی تحریک کی مثال بھی خوب دی ۔ جناب! یہ تحریک
کانسٹیٹیوشنل ہے ۔ اگر یہ تحریک باضابطہ چلائی جائے ۔ تو گورنمنٹ
کے اپنے اعلانات کے موافق اس کی عین خوشی اسی میں ہے ۔ کہ ہندوستان
کو سوراج ملے ۔ ۱۹۱۹ء کا اعلان شاہی ملاحظہ فرمائیے ۔ گورنمنٹ کی
خوشنودی ہندوستانیوں کے آزاد ہونے میں ہے ۔ ہاں بعض ملازمین
گورنمنٹ ہندوستانیوں کو خود مختار دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے ۔ تو کیا
آپ کے عقیدے میں اللہ میاں کے بھی قوانین محض نمائشی اعلان ہیں؟
اور رضائے الٰہی کسی اور چیز میں ہے؟ کسی قانون دان سے دریافت کیجئے ۔
قانون پر عمل کرنے سے حاکم ناراض ہوتا ہے یا ہونا چاہیئے؟ بالکل نئی
دریافت ہے ۔ مولانا کی اختراع پسند طبیعت کی داد دینے کو جی چاہتا
ہے ۔

خیر المنکرین کی تاویل فرمائی ہے ۔

'خیر الماکرین'، گلیڈسٹون اور مصطفےٰ کمال پاشا جیسے لائق پولیٹیشن اعیان کو کہا جاتا ہے۔ نہ کہ ہر کہ و مہ کو۔ (صفحہ ۹۳)

مولانا کو ان "اعیان" کی زندگی کا کیا پتہ؟ پولیٹیشن فریب کی تصویر ہوتے ہیں۔ اگر اللہ میاں بڑے پیمانے پر گلیڈسٹون یا مصطفےٰ کمال ہیں۔ تو واقعی خیر الماکرین ہیں۔

"کن فیکون" کی تشریح فرمائی ہے۔

بظاہر تو بچّہ کی پیدائش میں نو ماہ لگ جاتے ہیں۔ مگر حقیقت میں اس کی ان گنت کیفیات ہوتی ہیں۔ کہ ہر آن بدلتی ہیں۔ اور ہر آن خدا اپنے قانون قدرت سے ہو جا کہتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں "کن" عالم کی ابتدا میں نہیں کہا گیا۔ بلکہ ہر وقت کہا جاتا ہے۔ اب یہ ہر وقت کا خلق تو عدم سے نہیں۔ علت موجود ہی کا معلول کر دیتا ہے۔ تو کیا ابتدائی خلقت بھی ایسی ہی تھی؟

حضرت مولانا نے عدم سے موجودات کا خلق ثابت کرنے میں چند صفحات صرف کئے ہیں۔ مگر یہ ایک طویل مضمون ہے۔ مولانا کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ "مادہ بغیر کسی نہ کسی شکل کے ہو نہیں سکتا"۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مولانا مادہ اور مادی اشیا میں تمیز نہیں کر پائے۔ شکل مرکب کی ہوتی ہے۔ مفرد کی نہیں۔ ہم اس مضمون پر جدا کتاب "جواہر جاوید" لکھ چکے ہیں۔ ناظرین وہاں ملاحظہ کریں۔

رشی کا سوال ہے۔ خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا؟ مولانا کہتے ہیں۔ "جینیوں کو کیوں پیدا کیا؟" آریہ سماج کے عقیدے میں جینی ہوں۔ یا حضور والا۔ سب ارواح ازلی ہیں۔ ان کو معدوم سے موجود نہیں کیا گیا۔

کیا آپ کے نزدیک شیطان کی بھی یہی حالت ہے؟
رشی دیانند کے یہ پوچھنے پر کہ حوریں اس وقت کیا کام کرتی ہیں؟
فرماتے ہیں۔
قرآن کی کسی آیت سے دکھایئے۔ کہ وہ ابھی سے پیدا بھی ہو چکی ہیں۔
(صفحہ ۱۳۱)

مگر جب پھر سوال کیا گیا۔ کہ کیا نیک و بد لوگ قیامت تک دورہ سپرد رہیں گے؟ تو قرآن کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

قیل ادخل الجنۃ قال یا لیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین

ایک نیک آدمی مشرکوں کو سمجھاتا تھا۔ اُنہوں نے اس کو مار دیا۔ خدا فرماتا ہے۔ کہ اسے کہا گیا۔ کہ جنت میں داخل ہو جا۔ اس نے داخل ہو کر کہا۔ کہ کاش میری قوم کے لوگ جانیں۔ کہ کس طرح خدا نے مجھے بخشا۔ اور میری عزت کی۔ (صفحہ ۱۴۰)

دورہ سپرد رہنے سے بچانے کو جناب نے ایک شخص کو ابھی سے جنت میں داخل بھی فرما دیا۔ تو ذرا یہ بھی ارشاد فرما دیتے۔ کہ کیا وہ جنت بغیر حوروں کے ہے؟ جنت ہے مگر ہے بغیر سامان کے؟ اگر سب سامان موجود ہے۔ تو حوریں بھی موجود ہیں۔ اپنے دونوں اقوال کا ذرا تطابق کیجئے۔

شفاعت کے مسئلے پر فرماتے ہیں۔
قرآن اور سید الانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ اتباعہ وسلم کی سفارش بھی کیا کم ہے۔ کہ آپ کے وسیلے سے بہت سے کفار ناہنجار

راہ راست پر آئے۔
(صفحہ ۶۹)

کیوں؟ مسلمانو! یہی شفاعت ہے؟ یہی ہے تو کافروں کو بھی شفاعت کا حق ہو گیا یا نہیں؟ رشی دیانند کے اس اعتراض پر کہ بہشت محسوسات نفسانی کی جگہ ہے۔ اور وہاں تمام عشرتیں جسمانی ہیں تو وہاں بول و براز ہونے سے بھنگی وغیرہ کی ضرورت بھی ہو گی۔ مولانا کو مخول سوجھا ہے۔ لکھتے ہیں۔

کافروں سے ہی یہ کام خدا لے۔ تو کوئی ہرج کی بات نہیں۔ انہیں کو اس بیگار میں پھنسائے۔
(صفحہ ۲۱۶)

ان کی بلا سے۔ خدا بیگار کا رواج بھی جنت میں رکھے۔ اور پھر دعوٰے یہ ہے۔ کہ وہاں کوئی تکلیف نہیں۔ حضرت! یہ بھی تو لکھ دیا ہوتا کہ یہ بیگار میں پھنسے ہوئے کافر اپنی دوزخ کی آگ اور تھوہڑ اور گرم پانی اور کانٹے دار جھاڑیاں ساتھ لائیں گے۔ یا بہشت کی بیگار کی بدولت اس بلا سے چھٹی رہیگی؟ جیلخانے کے قلاصیوں والی بات ہے۔

حوروں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

جو کسی عورتوں سے جماع کی طاقت نہ رکھتا ہو گا۔ اس کو کئی عورتیں نہ ملیں گی۔ بلکہ اگر کسی کو ایک عورت سے بھی (مثل آپ کے) تکلیف پہنچیگی۔ تو ایک بھی نہ ملیگی۔
(صفحہ ۱۹۷-۱۹۸)

گویا وہاں رہبانیت جائز ہو گی۔ اتنا ہی غنیمت ہے۔ کوئی برہمچاری بھی رہ سکتا ہے۔ اور مومنات کی خوشی کا موجب کیا ہو گا؟ وہ بھی کیا برہمچارنی رہ سکتی ہیں؟

جنت کی شراب کو دنیا کا میٹھا اور لذیذ دودھ سمجھنا چاہئے (صفحہ ۲۰۱)

تو اس دُودھ کو شراب کہنے کی کیا ضرورت تھی ؟ دُودھ کو دُودھ نہ کہا جا سکتا تھا ؟ یا زبان عربی اس نعمت سے نا آشنا ہے ؟

غلمان کے بارے میں مولانا کی نئی اختراع سُنئے

یہ بچّے خود انہی جنّتیوں کی نابالغ اولاد ہوگی ۔ (صفحہ ۲۲۷)

مگر ان کے ذمہ خدمت تو ہے کاسے لئے پھرنا ۔ اپنے لڑکوں سے یہی کام لیا جاتا ہے ؟ جنّت کے آداب میں یہ بھی مان لو ۔ ان کے پیدا ہونے تک یہ خدمت کون کریگا ؟ یا یہ اولاد لحظہ بلحظہ پیدا ہوتی رہیگی ؟ تو وہ پھر جوان بھی ہونگے یا نہیں ؟ ان کی نشو و نما ۔ ان کی شادی ۔ ان کی اور ضروریات ۔ والدین پر بوجھ تو نہ ہونگی ؟ پھر ان کی بھی اولاد ہوگی یا نہیں ؟ جنّت میں درد زہ ۔ وضع حمل کی میعاد وغیرہ وغیرہ کے کیا قواعد ہیں ؟ کیا بہشتی بوڑھے بھی ہونگے ؟ یہ اولاد پیدا کرنا اور کھاپی کر بیگار کی ضرورت محسوس کرنا تو بتاتا ہے ۔ وہاں کی زندگی یہاں کی سی ہی زندگی ہے جس کو انزال لازم ہے ۔ مولوی صاحب سمجھ لیں ۔ نہیں ۔

قرآن کے نزول پر فرمایا ہے ۔

چونکہ اوّل مخاطب اس کے عرب لوگ تھے ۔ اس لئے اس زبان میں نازل ہوا ۔ اُنہوں نے اس کو سمجھ کر دوسرے لوگوں کو سمجھا دیا ۔ یہی عین انصاف ہے (صفحہ ۲۴)

مگر پھر کہا ہے ۔

قرآن مجید کلام الٰہی ازلی کا نام ہے ۔ جیسے آپ وید کی نسبت کہتے ہیں ۔ (صفحہ ۲۳۱)

ازلی کتاب کے مخاطب اوّل عرب کیوں ہوئے ؟ اِدھر تو دعوٰی یہ

ہے۔ کہ قرآن جیسی اور کتاب نہیں۔ اِدھر اہلِ عرب کے سوا اور سب اقوام کے لئے الہام تک رسائی ہی بالواسطہ کر دی ہے۔ کہ اہلِ عرب انہیں سمجھا دیں۔ آخر یہ سمجھانا بذریعہ تراجم ہوگا۔ اب یا تو تراجم کو قرآن کے برابر مانو۔ یا دیگر اہلِ عالم کو بھی اصل قرآن سے محروم نہ کرو۔ عین انصاف تو یہ ہوگا۔ جو آپ فرماتے ہیں۔ "وہ غینِ انصاف" ہے۔

مولانا کے استدلال کے یہ چند نمونے ہی عرض کئے ہیں۔ زیادہ ان کی کتاب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی ہر دلیل کا ازالہ کتاب ہذا میں ہو گیا ہے۔ ناظر ہوشیاری سے پڑھے۔ تو حق پرکاش کی ہر دلیل کا (جہاں تک وہ دلائل تھیں) جواب اس میں پائیگا۔

مولانا کی کتاب کا رد اس لئے بھی مناسب نہیں سمجھا۔ کہ مولانا کی تحریریں مبتذانہ سا آداب ہے۔ اور ہمارا ارادہ ہے منطقی مناظرے ہی میں رہنے کا۔

چلتے چلتے ایک دو باتیں اور بھی سن جائیے۔

گوشت خوری کا جواز دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بات خنزیر کی بھی خود بخود چلادی ہے فرمایا ہے۔ اور عین مولویانہ انداز میں فرمایا ہے

ایسا ہی سور بھی مضر صحت ہے۔ خصوصاً گرم ملکوں میں۔

یہ گرم ملکوں کی تخصیص مزا دے گئی۔ جب مضر صحت خصوصاً گرم ملکوں میں ہے۔ تو حرام بھی خصوصاً گرم ملکوں میں ہوگا۔

مولانا سے کس نے التجا کی تھی۔ کہ اسلام کو معقول ثابت کریں؟ حضرت نے اول تو معقولیت کے بہانے اسلام کا رنگ روپ ہی بدل ڈالا۔ لیجئے۔ اب لگے ہاتھ کہتے ہیں۔ اس کا نام کفر رکھ لو تو ہرج نہیں۔ لکھا ہے

باقی رہا غیر قوموں کا ہمیں کافر کہنا۔ ہم اس سے ناراض نہیں۔ کافر کے معنی 'منکر' کے ہیں۔

اس پر قرآن کی سند بھی دیدی ہے۔

کفرنا بکم

ہم تمہارے دین سے منکر ہیں۔

مولانا! کفر مبارک ہو۔ ستیارتھ پرکاش کا جادو ہے۔ کہ کافر کہلانے سے ناراض نہیں ہو۔ کچھ عرصہ اور گذرنے دو۔ اس خطاب منزلت مآب سے خوش ہوا کروگے۔

یہ تو ہوئی حضرت مولانا کی اپنے مذہب سے واقفیت یا اس کے حال عسرت مآل پر عنایت بے غایت۔ مولانا نے کہیں کہیں الزامی جواب بھی دئے ہیں۔ مگر الزامی جواب تو وہ دے۔ جو دوسرے فریق کے عقائد سے واقف بھی ہو۔ مولانا پرانے مناظر ہیں۔ لیکن آریہ دھرم سے جناب کتنے آشنا ہیں؟ ایک دو اقتباس سے ظاہر ہو جائیگا۔ رشی نے فرشتوں کا وجود ماننے پر اعتراض کیا ہے۔ جناب نے جوابًا اتھرو وید کے دو منتر پیش کئے ہیں۔ ایک میں کہا ہے۔

پرماتما کے اس خزینہ قدرت کو جس کی دیوتا حفاظت کرتے ہیں۔ کون جان سکتا ہے؟

حضرت! دیوتا کے معنی ہیں ودوان۔ حوالہ ستیارتھ پرکاش میں دیکھ لیجئے۔ باشندا پنچھ براہمن ہیں۔

(۲) تینتیس ۳۳ دیوتا اس پرماتما کے تقسیم کئے ہوئے فرائض کو پورا کررہے ہیں۔

ستیارتھ پرکاش کے ساتویں باب کے دوسرے صفحہ پر آپ کو یہ عبارت ملیگی۔

تینتیس قسم کے دیوتا ہیں یعنی زمین۔ پانی۔ آگ۔ ہوا۔ آکاش۔ چاند۔ سورج۔ ثوابت یہ آٹھ دُنیا کے جائے قیام ہونے کے باعث وسو کہلاتے ہیں۔ پران۔ اپان۔ ویان۔ اداں۔ ناگ۔ کورم۔ کرکل دیودت دھننجے۔ یہ دس قسم کے سانس اور جیو۔ ان گیارہ کا نام ادر .. .. سال کے بارہ مہینے .. .. .. آدتیہ کہلاتے ہیں۔

اس میں شت پتھ براہمن کا حوالہ بھی دیا ہے۔ کیا آپ کے یہی تینتیس فرشتے ، ہیں ؟

اس معمولی سی بات سے بے خبر ہونے سے تو جان پڑتا ہے۔ کہ مولانا میدان مناظرہ کے نام ہی سے واقف ہیں۔ اس کے نشیب و فراز کو نہیں جانتے۔ آپ نے جہاد کی تشریح کرتے ہوئے ویدا ور منوسمرتی کے حوالے دے دئے ہیں۔ کہ جیسے وہاں فنون جنگ و تدبیر ملکی کی تعلیم دی ہے۔ ویسے ہی قرآن میں بھی لڑنے کا حکم ہے حضرت! وہاں تو اپنی حفاظت مقصود ہے مولانا فرماتے ہیں۔ قرآن میں بھی یہی بات ہے اس میں حوالہ ؟ کہتے ہیں منو۔ جناب کسی اسلامی کتاب کا نام لیتے۔ قرآن تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ سب موجود تھا۔ مگر وہاں یہ بات ہوتی تب نہ دل سے وید اور منوسمرتی کے قائل ہو چکے ہیں۔ اب قرآن کو اسی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ بھائی! اپنی اپنی چال ہے۔ ایک جنس کا جاندار دوسری جنس کے جانداروں کی چال اختیار کرے۔ تو مذاق ہی ہوتا ہے۔ ہم نے اس موضوع کی نذر ایک جدا باب کیا ہے۔ اس لئے یہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

الغرض مولانا کے استدلال کو کیا کہیں اسلام کا انہوں نے خاکہ بدل دیا۔ ویدک دھرم پر بھولے پن میں وہ وہ راز دستیاں کردیں کہ ویدک دھرمی پڑھیں اور ہنسیں۔ کہ یا تھ(؟) کہہ دیا۔ یہ میخانہ ہے۔ تب تو حضرت! سب روا ہے ؟

ستیارتھ پرکاش کے اقتباسات
کی
اعجازی صحت

باب ذیل میں ہم ستیارتھ پرکاش کے ان حوالجات قرآنی پر غور کرینگے جن میں مولانا ثناء اللہ صاحب کے خیال میں رشی دیانند نے قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے "ایجاد بندہ" سے کام لیا ہے۔ مولانا کو اتنے بڑے مہاتما پر جس کی فضیلت روحانی سر سید احمد کے نزدیک اس قابل تھی۔ کہ اس پر الہام الٰہی نازل ہو۔ یہ الزام لگانے سے پیشتر اول ان اختلافات کا صحیح اندازہ لگانا چاہیئے تھا۔ جو آپ کی رائے میں رشی کے دیئے ہوئے ترجمہ اور قرآن کے صحیح مفہوم میں ہیں پھر ان حالات پر غور کر کے جن میں وہ ترجمہ کیا گیا تھا۔ اپنے ان الفاظ کو وزن کر لینا چاہیئے تھا۔ جو آپ نے رشی کی شان میں استعمال کئے ہیں۔ کسی کی نیت پر شک کرنا نہایت قبیح گناہ ہے۔ پھر ایسے شخص کی نیت پر جس نے کسی مذہب کو "پہلے سی ہی بری نظر سے نہ دیکھ کر ان کی خوبی کو تسلیم اور نقائص کو ترک" کر دینے کے عزم مصمم سے مذاہب عالم کی تنقید کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اور جیسے آپ

اِسی باب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ اپنے دلی خلوص کی وجہ سے اس میں کامیاب ہُوا ہے۔

رِشی دیانند عربی نہ جانتے تھے اردو رسم خط سے بھی واقف نہ تھے۔ انہوں نے ان کے اپنے بیان مندرجہ ستیارتھ پرکاش اور آپ کے اقبال مندرجہ حق پرکاش کے مطابق ایک مولوی صاحب (شاہ رفیع الدین) کے ترجمہ قرآن کا آریہ بھاشا میں ترجمہ کرایا۔ رِشی نے اسے پڑھا اور مولوی صاحبان سے اس کی اصلاح کرائی۔ مولوی صاحبان ناگری رسم الخط سے واقف نہیں ہوتے۔ انہیں وہ ترجمہ سنایا گیا ہوگا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہیں۔ کہ رِشی دیانند کے آریہ بھاشا کے ستیارتھ پرکاش میں درج شدہ ترجمہ قرآن شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ کے زیادہ نزدیک ہے۔ بہ نسبت اردو ستیارتھ پرکاش میں درج کئے گئے اس آریہ بھاشا کے اردو ترجمہ کے۔ آپ نے شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمے کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ "واضح مطلب خیز نہیں"۔ مناسب یہ تھا۔ کہ تمام آیات مندرجہ ستیارتھ پرکاش کا جہاں وہ ترجمہ درج کرتے۔ وہاں ساتھ ساتھ اپنا ترجمہ بھی لکھتے جاتے۔ تاکہ ناظرین آپ کا مفہوم سمجھ کر آپ سے متفق ہو جاتے۔ ایک دو مقامات کے علاوہ آپ نے اس ترجمہ کی تصحیح کی ضرورت نہیں سمجھی۔ جس سے واضح ہے۔ کہ بالعموم آپ اس ترجمہ سے متفق ہیں۔ اس ترجمہ کو دونوں زبانوں کے کسی واقف شخص نے ناگری حروف میں بدلا ہوگا۔ کیا آپ کو اس امکان کا قیاس ہے یا نہیں۔ کہ شاہ رفیع الدین کے "غیر واضح" اور "غیر مطلب خیز" ترجمہ کو آریہ بھاشا کا لباس پہناتے ہوئے مترجم سے کہیں سہو ہو سکتی ہے؟ مولوی صاحبان کے لئے اس کی

تصیحح فقط سُن کر کرنی ممکن تھی۔ اور چونکہ انہیں ان "غیر واضح" اور "غیر مطلب خیز" ترجموں کی مشق ہوتی ہے۔ جن کی بنیاد زبان عربی کا ہندوستانی زبانوں کے عالموں کے لئے غیر مانوس اور بے ربط محاورہ ہے۔ ممکن ہے۔ اُنہوں نے اسے زیادہ واضح یا زیادہ مطلب خیز بنانے کی ضرورت نہ سمجھی ہو۔ آپ نے بھی تو ایک دو مقامات پر ہی اس ضرورت کا احساس کیا ہے۔ اور وہ اُس وقت جب محقق کے اعتراضات آپ کے سامنے آ چکے ہیں۔

رشی نے وہ ترجمہ پڑھا۔ اور اسلامی عقائد کی تنقید فرمائی۔ رشی کی تحریر پڑھ کر یہ یقین ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ یا تو اس تصیحح کے دوران میں یا اس سے الگ کسی اور وقت رشی نے قرآن کی تفاسیر بھی سُنی ہیں۔ کیونکہ رشی کے اعتراضات ایسے ہیں۔ جو قرآن کی سطحی لغات تک ہی نہیں۔ بلکہ ان کے معانی کی اندرونی تہ تک۔ جس کا انکشاف تفاسیر میں بیان کردہ مطالب کے ساتھ ساتھ پڑھنے سے ہی ہوتا ہے۔ پہنچتے ہیں۔

ان حالات میں تحریر کرائی گئی تنقید پر فقط لفظی بحث نہ کرنی چاہیئے۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے۔ کہ اگر حوالہ میں درج ہوئے الفاظ بدل بھی دئے جائیں۔ تو کیا اعتراض قائم رہتا ہے یا نہیں؟ ہم نے آپ کی کتاب میں ستیارتھ پرکاش کے جابجا اقتباسات دیکھے ہیں۔ آپ نے یہ اقتباسات اُردو ستیارتھ پرکاش سے لئے ہیں۔ آپ کے لئے نہ ترجمہ کی مشکل ہے اور نہ مولویوں کی معرفت تصیحح و توضیح کی ضرورت ہے۔ لیکن ذرا غور تو فرمایئے۔ آپ نے ان اقتباسات میں کیا کیا قطع و برید سے کام نہیں لیا؟ نمونہ کے لئے ایک دو مثالیں کافی ہونگی۔

آپ کی کتاب کے ٹائیٹل پیج پر لکھا ہے۔ "ستیارتھ پرکاش متعلقہ قرآن شریف کا معقول اور مقبول جواب"۔ آپ نے اس رسالے میں ستیارتھ پرکاش کے چودھویں سملاس کو فقرہ وار درج کیا ہے۔ پھر مدقق بن کر جواب دیا ہے۔ ان تمام فقروں سے پہلے دو صفحہ کا ضمنی دیباچہ ہے۔ اسے آپ ایک سرے سے دوسرے سرے تک حذف کر گئے ہیں۔ اس کی وجہ؟ کیا وہ تنقید طلب نہیں؟ کتاب کا مدّعا اس کے دیباچہ میں مذکور ہوتا ہے۔ کیا آپ نے ناظرین سے یہ انصاف کیا ہے کہ جس کتاب کا آپ جواب دینے بیٹھے ہیں۔ اس کے مصنّف کے منشا سے ہی انہیں بیخبر رکھا ہے؟ پھر اس بات کا ذکر تک نہیں کیا۔ کہ کوئی دیباچہ ہے۔ جو ہم کسی ناقابل اظہار غرض سے طبع نہیں کرتے؟ رشی کی کتاب میں آپ کہیں اتنا لمبا حذف دکھا سکتے ہیں؟ یہ تو ہوئی آپ کے جواب کی ابتدا۔ اب آگے دیکھیے۔

(۱) صفحہ ۴ پر آپ نے ستیارتھ پرکاش کے دیباچہ سے مندرجہ ذیل اقتباس کیا ہے۔

ہٹ دھرمی کی عقل تاریکی میں پھنس کر زائل ہو جاتی ہے

ستیارتھ پرکاش کے دیباچہ میں یہ فقرہ جوں کا توں دکھا دیں۔ تو من مانا انعام حاصل کریں۔

غالباً یہی حوالہ آپ نے صفحہ ۷ پر دیا ہے۔ وہو ہذا
بہت سے ایسے ضدی اور متمرد ہوتے ہیں۔ کہ وہ متکلم کے خلاف منشا تاویل کرتے ہیں۔ خصوصاً مذاہب والے لوگ۔ کیونکہ مذہب کے پاس خاطر سے ان کی عقل تاریکی میں پھنس کر زائل

ہو جاتی ہے۔
صفحہ ۷۸ پر پھر یہی حوالہ یوں مرقوم ہے۔
بعض ضدی لوگ خلاف منشا متکلم کے "تاویل کرتے ہیں۔
کیا " بہت سے " اور " بعض " مترادف ہیں ؟ اور " بہت سے ایسے .. .. خاطرے ان " کا قائم مقام " ہٹ دھرمی " ہے ؟
مولانا! ان حوالہ جات کو پڑھ جائیے اور فیصلہ آپ پر رہا۔ کہ آیا یہ اقتباسات لفظاً ومعناً صحیح ہیں؟ پھر اسی کسوٹی پر رشی دیانند کے اقتباسات کو رکھیے۔ اور داد دیجیے۔ کہ رشی نے کتنے صحیح اقتباسات کئے ہیں!
صفحہ ۷۰ پر ستیارتھ پرکاش کا مندرجہ ذیل حوالہ آپ نے درج فرمایا ہے۔
جس طرح جیو خود مختاری سے کام کرتا ہے۔ اسی طرح علیم کل ہونے سے ایشور جانتا ہے۔ (اور جیسا ایشور جانتا ہے) اسی طرح جیو کام کرتا ہے۔ یعنی ایشور ماضی مستقبل اور حال کے علم میں اور نتیجہ دینے میں خود مختار ہے۔ اور جیو کسی قدر زمانہ حال کے علم میں اور کام کرنے میں خود مختار ہے۔ ایشور کا علم ازلی ہونے کے باعث فعل کے علم کی طرح سزا دینے کا علم بھی ازل سے ہے۔ اس کے دونو علم سچے ہیں۔ کیا فعل کا علم سچا اور سزا دینے کا علم کبھی جھوٹا ہو سکتا ہے؟ پس اس میں کوئی بھی نقص نہیں۔
مندرجہ بالا اقتباس کی پہلی سطر میں جو فقرہ ہم نے خطوط وحدانی میں بند کر دیا ہے۔ وہ آپ کی کتاب کے نہ بار پنجم کی اشاعت میں درج ہے۔ اور نہ بار ششم کی اشاعت میں۔ اس سے پہلے کی اشاعتیں ہماری

نظر سے نہیں گزریں۔ یہ دو مثالیں ہم نے مُشتے نمونہ از خروارے یہاں نقل کر دیں۔ ورنہ سلوک دیگر حوالہ جات کے ساتھ بھی اس سے بہتر نہیں ہوا۔ آپ کو تو ان حوالجات کے اپنی کتاب میں درج کرنے کے لئے انہیں فقط نقل ہی کر دینا تھا۔ پھر بھی آپ سے پیہم لغزشیں ہو گئیں رشی دیانند کے اقتباسات کتنے مرحلوں سے گزرے۔ پھر بھی وہ اتنے درست رہے! آپ کو داد دینی چاہئے تھی۔ نہ کہ "نافہمی اور دروغگوئی" کے حقیر اور ذلیل الزامات تراشنے زیبا تھے۔ رشی دیانند کی ذات بابرکات ان اتہامات کے اثر سے بالاتر ہے۔ اس لئے آپ کی کرخت تحریر پڑھ کر ہمیں ہنسی آتی ہے۔ غصّہ نہیں آتا۔ تعجب اس امر کا ہے۔ کہ آپ جیسا پُرانا اور مشاق مصنف جسے ہمیشہ تحریر کے کام سے واسطہ ہے۔ اور جو کتابوں کے لکھنے۔ لکھانے۔ چھپوانے کے تمام مراحل سے واقف ہے۔ ستیارتھ پرکاش کے اقتباسات کے راستے میں حائل ہونے والی صریح مشکلات کو جانتا ہوا بھی اس میں درج ہوئے اقتباسات کی تعجب خیز صحت کی تعریف کرنے کی بجائے بیجا تذمیم کیوں کرتا ہے؟ خیر یہ آپ کا اپنے پرماتما سے واسطہ ہے۔ آئیے۔ اب آپ کے الزامات کی پڑتال کریں۔

(۱) سورہ بقر آیت ۲۴ کے آخری حصّے کا ترجمہ شاہ رفیع الدین نے یوں کیا ہے۔

واسطے ان کے بیچ ان کے بیبیاں ہیں پاک کی ہوئیں۔ اور وہ بیچ ان کے ہمیشہ رہنے والے۔

اس میں شک نہیں۔ کہ عربی لفظ خالدون صیغہ مذکر ہے۔ مگر ایک

عربی نہ جاننے والے کے لئے جس نے اُردو سے آریہ بھاشا میں اس فقرے کا ترجمہ کیا ہوگا۔ یہ ایک ساتھ مذکر اور مؤنث عبارت سوائے چیستاں کے کیا ہے؟ اردو رسم کا خط یہ بھی دستور رہا ہے۔ کہ یائے تحتانی اور یائے فوقانی کو بلا تمیز ایک دوسرے کی جگہ لکھ دیتے ہیں۔ اس نے سمجھا۔ "ہمیشہ رہنے والی" ہو تو فقرہ معقول اور موزوں ہو جائیگا۔ رشی نے اسے جوں کا توں اپنی کتاب میں درج فرما دیا۔ آپ نے آوازہ کسا۔

"آپ کے کان میں والی (بالی) پڑ گئی۔"

حضرت! کاتب کی اس سہو سے ہوا تو یہی نہ کہ حُوروں کو بہشت میں ہمیشہ رہنے والی سمجھا گیا۔ کیا وہ ہمیشہ رہنے والی ہیں یا نہیں؟ سورہ کہف آیت ۳۰ میں بہشت کو "جنات عدن" ہمیشہ رہنے والے باغ۔ اور سورہ دہر آیت ۱۹ میں غلمان کو صاف "ولدانٌ مخلدون" کہا ہے۔ جب حور و غلمان وہاں ہمیشہ رہتے ہی ہیں۔ تو پھر چاہے۔ حوالہ کی تصیحح کر لو۔ تنقید قائم رہے گی۔ کہ وہ کس عمل کے بدلے وہاں رہتی ہیں؟ اور جنتیوں کے وہاں جانے سے پیشتر کیا کرتی ہیں؟ اہلِ جنت کے ہمیشہ وہاں رہنے پر رشی نے الگ اعتراض کیا ہے؟

(۲) سورہ بقر آیت ۱۱۰ سے مندرجہ ذیل اقتباس کیا گیا ہے۔

ایسا نہ ہو کہ کافر لوگ حسد کر کے تم کو ایمان سے منحرف کر دیں۔ کیونکہ ان میں سے ایمان والوں کے بہت سے دوست ہیں۔

اب ملاحظہ ہو۔ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ۔

اور دوست رکھتے ہیں بہت اہل کتاب میں سے کاش کہ پھیر دیں

تم کو پیچھے ایمان تمہارے کے کافر حسد سے ۔

مؤخر الذکر ترجمہ کا سر پیر بنائیے ۔ تماشہ یہ ہے ۔ کہ آپ نے اس ترجمے پر ایک لفظ بھی نہیں لکھا ۔ بلکہ اس کے بعد کی آیت کا اندراج کر کے دعوٰے کیا ہے ۔ کہ " اگر کوئی سماجی دوست پنڈت جی کا منقولہ ترجمہ ہمیں دکھا دیں ۔ تو ہم مبلغ صد روپیہ ان کی نذر کریں گے " ان دو نو ترجموں میں فرق " ایسا نہ ہو " اور " کاش کہ " کا ہے ۔ ' ایسا نہ ہو ' کا کچھ مطلب ہے ۔ " کاش کہ " کا کچھ نہیں ۔ اس تھوڑے سے فرق نے آپ کی کتاب کے طبع اول کے دوران میں آپ کو یہ خبر بھی نہ ہونے دی ۔ کہ قرآن میں اس مفہوم کی کوئی آیت ہے ۔ آخر ایک آریہ مہاشے نے یہ آیت آپ کو دکھائی ۔ تو بجائے اس کے کہ طبع دوم میں طبع اول کی بیجا اور خلاف آداب طعن و تشنیع کو حذف کر دیتے ۔ وہ سب دُرافشانیاں بھی جو آپ کے اپنے اغماض یا تجاہل عارفانہ کا نتیجہ تھیں ۔ رہنے دیں ۔ اور پھر اس آیت کا ترجمہ کیا ۔

بہت سے اہل کتاب یہود اور نصاریٰ چاہتے ہیں ۔ کہ تم کو ایمان لانے کے بعد محض اپنی ضد اور حسد سے باوجود حق ظاہر ہو جانے کے کافر بنائیں ۔

کیا یہ لفظی ترجمہ ہے ؟ رشی نے تو دیباچہ میں ۔ جسے آپ نہ جانے کس غرض سے حذف کر گئے ۔ لکھ ہی دیا ہے ۔ کہ

مولوی صاحبان کے ترجمے کی پہلے تردید کر کے بعد ازاں اس مضمون پر قلم اٹھاتے ۔

انصاف کا تقاضا یہ تھا ۔ کہ آپ شاہ رفیع الدین کو ملزم قرار دیتے ۔

نہ کہ رشی دیانند کے مُنہ آتے۔ جنہوں نے ایک مہمل عبارت کو کچھ مطلب عطا کیا۔ چلیئے۔ ترجمہ آپ کا درست۔ رشی کا اس آیت پر اعتراض یہ ہے۔

دیکھیئے۔ اب خدا ہی ان کو یاد دلاتا ہے۔ کہ تمہارے ایمان کو کافر لوگ نہ گرا دیں۔ کیا خدا ہمہ دان نہیں ہے ؟

اس یاد دلانے سے تو آپ بھی منکر نہ ہونگے۔ ورنہ اس آیت کی علّت غائی ہی کچھ نہیں رہتی۔ رہ جاتا ہے اللہ میاں میں ہمہ دان نہ ہونے کا نقص۔ اس کو سمجھنے کے لیئے اعتراض نمبر ۱۱ کی طرف توجہ فرمائیے۔ جہاں لکھا ہے۔

اس سے ثابت ہوا۔ کہ خدا ہمہ دان نہیں۔ یعنی ماضی۔ حال۔ استقبال کی باتیں پورے طور پر نہیں جانتا۔ (اگر جانتا) تو شیطان کو پیدا ہی کیوں کرتا ؟

مولانا! اس اعتراض کو نقل کرتے ہوئے پھر آپ (اگر جانتا) کو نہ جاننے کیا سمجھے ہیں۔ وہ اردو ستیارتھ پرکاش میں درج ہے اور آپ کے حق پرکاش میں نہیں۔ اس دزدیدہ نظری کو کیا کہا جائے؟ ذرا اندازہ لگائیے۔ اس حذف سے ناظر کو کس قدر مغالطہ ہوتا ہے ؟ خیر۔ ہمارے آپ کو اس فقرے کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بھی وہی ہمہ دان نہ ہونے کا نقص ظاہر کیا ہے۔ جو مندرجہ بالا آیت پر تنقید کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے۔ یہاں شیطان اہل کتاب کے ایمان میں مخل ہے۔ وہاں اہلِ کتاب تھے۔ اللہ میاں کو بقول آپ کے معلوم یہ سب کچھ تھا۔ مگر پھر رشی پوچھتے ہیں۔ کہ اول شیطان کو اور پھر ان

اہل کتاب کو پیدا کیوں کیا ؟ مولانا ! کہیں پھر یہ نہ کہدینا۔ جیسے جینیوں کو پیدا کیا۔ جینیوں کی ارواح عدم سے وجود میں نہیں آئیں۔ وہ ازلی ہیں۔ اور فاعل مختار ہیں۔ شیطان اور اہل کتاب آپ کے اعتقاد میں ازلی نہیں۔ حادثہ ہیں۔ اللہ میاں کے بنائے ہوئے ہیں۔ اور جیسے وہ ہیں۔ ایسے ہی بنائے گئے ہیں۔ فرمائیے۔ اللہ میاں نے علم رکھتے ہوئے انہیں ایسا بنایا ہے۔ یا بے علمی میں ؟ علم رکھتے ہوئے بنایا ہے۔ تو معاذ اللہ نیت نہایت مبارک ہے۔ اور بے علمی میں بنایا ہے۔ تو ہمہ دان نہیں۔

لیجئے۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمہ کی جگہ جو رشی نے نقل فرمایا ہے۔ اپنا ترجمہ رکھ لیجئے۔ اور نیچے اعتراض یہی رہنے دیجئے۔ اعتراض سمجھ میں نہ آئے۔ تو نمبرا پر غور کیجئے۔ پھر بھی دقت ہو۔ تو صفحات ہذا ملاحظہ فرما لیجئے۔

(۳) سورہ بقر آیت ۱۳۱ کے آخری حصہ کا ترجمہ یوں ہوا ہے۔

اور حقیقت میں آخرت میں وے ہی نیک ہیں۔

آپ نے اس ترجمہ کا مصنف "کسی بڑھیا" کو قرار دیا ہے۔ بوڑھے اور بڑھیا میں کچھ بہت فرق تو نہیں ہوتا۔ خیر یہ ہوئی آپ کی میخانہ والی دل لگی۔ آپ کو اعتراض کیا ہے ؟

مفرد کو جمع کی صورت میں بدل کر ناحق تناسخ کا ثبوت دیا ہے۔

مولانا ! اس اعتراض کی ماہیت کوئی بڑھیا ہی سمجھے۔ مفرد کو جمع کرنا کجا۔ اور تناسخ کجا۔ حضرت ابراہیم کا ذکر ہے۔ تعظیماً جمع کر دیا ہے۔ آپ نے لکھا جو ہے۔

"محمد پیدا ہوا"۔ "محمد کہتا تھا" جو ایک ادنےٰ درجہ کے لوگوں کے لئے ہے۔

رشی کے اعتراض کا مرجع تو کوئی جماعت نہیں۔ فقط حضرت ابراہیم ہیں۔ آپ واحد کا صیغہ لکھ لیجئے۔ اعتراض وہی کا وہی رہیگا۔

(۴) سورہ بقر آیت ۲۵۰ کا اقتباس یوں ہوا ہے:

جو کچھ زمین اور آسمان پر ہے۔ سب اسی کے لئے ہے۔ چاہیے اس کی کرسی نے آسمان اور زمین کو سما لیا ہے۔

اس پر آپ فرماتے ہیں۔

"چاہیے" کا لفظ نقل کرکے پنڈت جی نے ہمارے دعویٰ کی تصدیق کر دی۔ کہ آپ سمجھ اور دیانت سے کام نہ لیتے تھے۔

فقط نقل کیا ہے۔ تو دیانت پر حرف کیوں؟ آپ اپنی نقل پر جس کے حوالے اوپر دئیے جا چکے ہیں۔ غور فرمائیے۔ اور پھر کسی دوسرے پر حرف گیری کیجئے۔ مولانا! آپ 'چاہیے' محذوف کر دیں۔ اس سے محقق کے اعتراض پر کیا حرف آتا ہے؟ بددیانتی وہاں ہوتی ہے۔ جہاں کسی بے بنیاد اعتراض کی خاطر متن میں تبدیلی کی جائے۔ یہاں اعتراض کی بنیاد 'چاہیے' تو ہے نہیں۔ آیت ہے۔ اس کا ترجمہ بغیر 'چاہیے' کے رہنے دیجئے۔

(۵) سورہ حج۔ آیت ۲۲ کا ترجمہ کیا ہے۔

پاک کر گھر میرے کو واسطے گرد پھرنے والوں کے اور کھڑا رہنے والوں کے ... ...

اس پر رشی نے اعتراض کیا ہے۔

جب خدا کا گھر ہے ۔ ۔ ۔

مولانا فرماتے ہیں ۔

سوامی جی ! خدا کا گھر کس لفظ کا ترجمہ ہے ۔ ۔ ۔ ساد ہو ہو کر ایسی چالاکی تو مناسب نہیں ۔ کہیں آپ وُہی ساد ہو تو نہیں ۔ جو بالائی سمیت پیا کرتے ہیں ۔

حضرت ! آیت میں آیا ہے ۔ 'طھر بیتی' پاک کر میرا گھر ۔ اس ضمیر متکلم کا اشارہ میرے یا آپ کے گھر کی طرف نہیں ۔ خدا کہہ رہا ہے ۔ خدا ہی کا گھر ہوگا ۔ مولانا ہو کر یہ اغماض ۔ کہ قرآن شریف کے صاف الفاظ کو بالائی بنا کر اُڑا گئے ؟ مولانا کو بالائی سے کام ؟

(۶) سورہ احزاب کی آیت ۶۸ یہ ہے ۔

رَبَّنَا اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا

اس کا ترجمہ ستیارتھ پرکاش میں یوں کیا گیا ہے ۔

اے رب ہمارے دے ان کو دُگنا عذاب اور لعنت کر ان کو لعنت بڑی ۔

یہ آیت پوری کی پوری درج کی گئی ہے ۔ مگر حضرت یوں فرماتے ہیں ۔ ہم سماجی بھائیوں سے داد خواہی کے لئے وہ آیت پوری کی پوری نقل کرتے ہیں ۔

وَقَالُوْا رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ٥ رَبَّنَا اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ٥

انصاف مولانا پر رہا ۔ یہ ایک آیت ہے یا دو ؟ دو آیتوں کو پوری آیت (صیغہ واحد) کہہ کر کیا آپ نے دیانت داری کا ثبوت دیا ہے ؟

یا صیغہ واحد معاذ اللہ تحقیراً استعمال ہوا ہے۔ مولانا! قرآن شریف کے متعلق یہ راست بازی؟ جب آیتیں ہی دو ہیں۔ تو پھر پہلی آیت کو دوسری آیت سے الگ سمجھا جائے۔ اس میں ہرج کیا ہے؟

چلو۔ مولانا کی ہی مان لو۔ کہتے ہیں۔

اس آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو بوجہ شامت اعمال جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ تو اس وقت یوں کہیں گے۔ "اے ہمارے مولا! ہم نے بُری باتوں میں اپنے رئیسوں اور بڑوں کی اطاعت کی۔ تو انہوں نے ہم کو گمراہ کیا۔ اے ہمارے خدا! تو ان کو ہم سے دوگنا عذاب دے۔ اور بڑی بھاری لعنت اور پھٹکار کر۔"

آیتیں الگ الگ دو ہونے کی وجہ سے ہم مؤخرالذکر آیت کو دوزخیوں کے کلام کا حصہ ماننے پر مجبور نہیں کئے جا سکتے۔ لیکن مولانا کے لحاظ سے اسے بھی جہنمیوں کا کہا مان لیتے ہیں

جہنم کی گفتگو تو ابھی مستقبل کی صورت ہے۔ کون جانے۔ دوزخی کیا کریں گے۔ اور کیا نہ کریں گے؟ کیا ان کا کوئی ڈیپوٹیشن مصنف قرآن کی خدمت میں آیا تھا۔ کہ ہم ایسا کہیں گے؟ جو شخص قرآن کو الہامی نہ مانتا ہو۔ جیسے رشی دیانند نہیں مانتے تھے۔ اس کے لئے یہ تصور قرآن کا اپنا ہی ہے۔ کوئی بات اپنے منہ سے نہ کہی۔ دوسرے کی زبان سے کہلوا دی علم الاذہان کے ماہر جانتے ہیں۔ کہ ایسی خواہش در اصل بیان کرنے والے کی اپنی خواہش ہوتی ہے۔ جس کے منہ میں یہ خواہش ڈالی گئی ہے۔ وہ تو اس سے ہے ہی بے خبر۔ اس لئے اعتراض قائم ہے۔

مولانا کی دریادلی دیکھو۔ فرمایا ہے۔

سماجیو! اگر قرآن شریف کی آیت کا وہ مطلب ہو۔ جو سوامی جی لکھتے ہیں۔ تو ہم تمہارے گورو کل (دینی مدرسہ) اور کالج کے لئے مبلغ ۵۰۰ روپے نقد دیں گے۔ مرد میدان بنو۔ ایسے ایک دو مقامات کا ثبوت ہی دکھاؤ۔ مانا کہ تمہیں روپے کی طمع نہیں۔ اپنے گورو کی عزت تو چاہتے ہو۔ ورنہ دُنیا کیا سمجھیگی۔ اور سوامی جی پرلوک (دوسری جوُن) میں تم کو کیا کہیں گے؟

دُوسری جوُن کے اشارے پر بھی ناظر نظر رکھیں۔ مولانا! یہ دُعا جہنمیوں کی نہ ہو کر اگر جنتیوں کی ہو جائے۔ تو ہرج کیا ہے؟ اللہ میاں نے دوسری جگہ دوگنا عذاب دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ جیسے

تضعف له العذاب یوم القیامة

دُگنا کیا جائیگا ان کے لئے عذاب قیامت کے روز۔

جب خدا کا یہ قانون ہے۔ تو پھر اس کے عمل میں لائے جانے کی کسی نے دعا بھی کر دی۔ تو ہرج کیا ہوا؟ آپ خواہ مخواہ لال پیلے ہوئے۔ اور روپے لٹانے لگے۔ نہ میاں! آریوں کی درسگاہوں میں روپیہ نہیں دینا۔

آپ کی ان دریا دلیوں کے دوران میں آپ کا ایک اور وعدہ یاد آ گیا۔ جو آپ کی کتاب کے صفحہ ۲۳۰ پر درج ہے۔ سوامی دیانند نے لکھا ہے۔

اگر حمل وغیرہ بُرجوں کو بُرج کہتا ہے۔ تو اور بُرج کیوں نہیں؟

آپ نے اس پر تحریر فرمایا ہے۔

قربان ایسی سمجھ پر! سوامی جی! بروج سے مراد سیاروں کی منزلیں ہیں ...... ہاں ہم یہ نہیں سمجھے۔ پنڈت جی کیا کہتے ہیں۔ کہ "اگر حمل وغیرہ"

"... ... تو اور برج کیوں نہیں ؟" کوئی سماجی دوست اس کا مطلب ہمیں سمجھا دے۔ تو ہم مشکور ہونگے۔ اور ایک نسخہ اسی کتاب کا ان کی نذر کریں گے۔ ہمیں تو (بے ادبی معاف) دیوانے کی سی بڑ معلوم ہوتی ہے۔

مولانا! یہ کیا لکھ گئے۔ "بے ادبی معاف!" آپ کو تو لکھنا چاہیئے تھا۔ "با ادبی معاف!" مگر ہیں آپ بڑے سیانے۔ مقدمہ ورتمان کے دوران میں صاف کہہ گئے۔ میرا کوئی آریہ سماجی دوست نہیں۔ کہ شاید کوئی اس سمجھ میں نہ آنے والے نکتہ کو ذہن نشین کرا ہی دے۔ تو کہہ دینگے۔ بھائی + دوست ہونے کی شرط بھی تو ہے۔ خیر۔ کسی مولوی صاحب کی باریک سمجھ میں یہ موٹی بات آجائے۔ ہے تو مشکل لیکن پھر بھی کسی مولوی صاحب کی مدد لئے لیتے ہیں۔ تفسیر حسینی میں لفظ بروج کے دو ترجمے کئے ہیں۔ ایک تو یہی جو مولانا نے درج فرمایا ہے۔ ستاروں کی منزلیں اور دوسرا دروازہ ہائے قلعہ۔ کیوں؟ مولانا! انہیں بھی برج کہتے ہیں نہ؟ اور آپ کا یہ بھی اعتقاد ہے۔ کہ قرآن میں یہ سنا ہے گویا برج ہیں جہاں شیطان جاتے ہیں۔ اور آسمان میں ہو رہی مشورتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں۔ اور انہیں شعلوں سے مارا جاتا ہے؟ حوالہ چاہیئے۔ تو اسی کتاب کے صفحہ ۲۰۹ سے ۲۴۴ تک میں ملاحظہ فرمائیے۔ کہو۔ استاد۔ وہ ہیں "اور برج" کہ نہیں؟ 'دیوانے کی بڑ' سیانے کی سمجھ میں اب بھی آئی یا نہیں؟ آپ کی کتاب محفوظ ہے۔ ہم آپ کی دوستی کا نہیں۔ عقیدتمندی کا دم بھرتے ہیں۔

۷۔ سورہ بقر کی آیت ۲۵ کا ترجمہ ذیل درج ہوا ہے۔

اس آگ سے ڈرو کہ جس کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر کافروں کے واسطے تیار کئے گئے ہیں۔

شاہ رفیع الدین نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

پس ڈرو اس آگ سے جو ایندھن اس کا آدمی ہیں اور پتھر تیار کی گئی ہے واسطے کافروں کے۔

اتفاق ایسا ہے۔ کہ شاہ صاحب نے فعل 'ہیں' آدمی کے بعد درج کر دیا ہے۔ اور لفظ پتھر کے بعد وقفہ کا نشان (۔) نہیں دیا۔ آریہ بھاشا میں ترجمہ کرنے والے نے 'ہیں' کے بعد وقفہ سمجھ لیا ہے۔ اور "پتھر" فاعل کر دیا ہے۔ "تیار کی گئی ہے" کا۔ "تیار کی گئی ہے" کا اور فاعل ہے بھی نہیں پتھر کی مناسبت سے "کی گئی ہے" کو "کئے گئے ہیں" بنا دیا۔ کیونکہ پرانے اردو رسم خط میں یائے تحتانی اور یائے فوقانی کی تمیز نہ کی جاتی تھی۔

عربی کے محاورہ کی ہندوستانی نظر سے بے ربطی اس ساری غلطی کا جو شاہ رفیع الدین کے ترجمہ سے شروع ہوئی۔ اور اس ترجمہ کو آریہ بھاشا میں تبدیل کرنے والے کے ہاتھوں اور آگے لے جائی گئی۔ موجب ہوئی ہے۔ لیکن اس سے بھی قرآن کے اصل معنی میں کیا فرق ہوا ہے؟ آگ کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ اس کے کیا معنے؟ انسان تو مُدرک ہے۔ اسے تکلیف ہو گی۔ پتھر کو کیا تکلیف؟ مفسروں نے پتھر سے مراد لئے ہیں پتھر کے بت بھلا انہیں آگ میں ڈالنے کے کیا معنے؟ ان بے جانوں کا کیا قصور۔ کہ اُنہیں جاہلوں نے اللہ کا شریک کر دیا؟ اس سے تو پتھر کا مصرف یہی اچھا ہے۔ کہ ان سے جہنمیوں کی سرزنش کی جائے۔ اگر اہل اسلام "اعدت" کا صیغہ واحد مونث سے بدل کر جمع مذکر کر لیں۔ تو آیت کے نسبتاً معقول

معنے بن جائیں گے۔ اور اگر مہمل عبارت کو مہمل ہی رکھنا ہے۔ تو اس میں ان کا اختیار ہے۔

۸۔ سورہ توبہ کی آیت ۲۱ کا ترجمہ شاہ رفیع الدین نے یوں کیا ہے۔

اللہ نزدیک اس کے ہے ثواب بڑا۔

ستیارتھ پرکاش میں ترجمہ جوں کا توں درج ہوا ہے۔ اس سے پہلے بہشتیوں کا ذکر ہے۔ رشی نے سمجھا۔ ضمیر 'اس' کا اشارہ ان کی طرف ہے۔ انہیں کیا معلوم عربی کا محاورہ ہی ایسا بے ربط ہے۔ کہ اس میں 'اللہ کے نزدیک' کی جگہ 'اللہ نزدیک اس کے' بھی استعمال ہوتا ہے؟ رشی نے اعتراض اس پر یہ کیا ہے۔ کہ جو اللہ کسی کے نزدیک اور کسی سے دور ہو۔ تو وہ محدود ہے۔ سو تو ہم نے باب سوم میں متعدد حوالہ جات قرآن سے ثابت کیا ہے۔ کہ وہ ایسا ہے۔ قرآن کی یہ آیات رشی دیانند کے سامنے تھیں۔ وہ جانتے تھے۔ کہ قرآن کا اللہ میاں کا تصور ایک محدود شخص کا تصور۔ اس کی طرف فرشتے آتے جاتے ہیں۔ اس کے دائیں بائیں بہشت اور دوزخ ہونگے۔ اسے رشی نے یہاں بھی محدود کہہ دیا۔ تو اس میں نئی بات کیا ہوئی؟ آپ اس محدودیت کا ازالہ کریں۔

(۹) سورہ نحل کی آیت ۵۷ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے۔

اور مقرر کرتے ہیں واسطے اللہ کے بیٹیاں۔ پاکی ہے اس کو اور واسطے ان کے ہیں جو کچھ کہ چاہیں۔

آریہ بھاشا ستیارتھ پرکاش میں پاکی کی جگہ پوترتا درج ہے۔ باقی شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمے کی نقل ہے۔ مولانا نے نہ معلوم 'ان'

کی جگہ "اُس" کہاں سے لے لیا ہے۔ کہ اس پر اتنا طوفان کھڑا کیا ہے۔ کہ اِدھر رشی کو بے نقط سنائی ہیں۔ اِدھر آریہ سماجیوں کو۔ کہیں ترجمہ غلط معلوم ہو۔ تو اصل کتاب دیکھ لینی چاہیئے۔ ورنہ غلطی کا ذمہ دار مترجم ہے۔ نہ کہ اصل کتاب کا مصنف۔ ہمارے سامنے تو ترجمہ بھی غلط نہیں۔ لیکن احتیاطاً ہم نے آریہ بھاشا کے ستیارتھ پرکاش میں یہ فقرہ دیکھ لیا۔ یہ ہوئی ترجمہ کی بات۔ اب اعتراض پر آئیے۔ مولانا لکھتے ہیں۔

سوامی جی سمجھے کہ مسلمان خدا کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں رشی کی تنقید یہ ہے۔

اللہ بیٹیوں سے کیا کرے گا؟ بیٹیاں تو کسی آدمی کو چاہئیں بیٹے کیوں نہیں مقرر کئے جاتے؟ اور بیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں۔ اس کا کیا باعث ہے؟

مولانا انصاف آپ پر۔ فرمائیے۔ رشی نے بیٹیوں کا مقرر کرنا مسلمانوں سے کہاں منسوب کیا ہے؟ یہ تو خواہ مخواہ بلی کے خواب والی بات ہے۔ رشی نے لکھا ہی تو ہے۔ کہ 'قرآن کی خدا بیٹیاں کو تسلیم کرتا ہوں'۔ مگر ہاں! آپ نے تو اس سملااس کا ضمنی دیباچہ اپنی کتاب میں درج ہی نہیں فرمایا۔ آپ اس میں آئے فقروں کی طرف لوگوں کا دھیان کیوں جانے دینے لگے؟ مولانا! کیا اس میں آپ کو کوئی حرج ہے۔ کہ رشی دیانند کہیں کہیں مصنف قرآن کے ہمنوا ہو جائیں؟ آپ ساری تنقید کے دوران میں رشی دیانند کی یہ خوبی دیکھیں گے۔ کہ قرآن کے کسی مسلمہ کا

کا حسن جہاں تک وہ قابل اعتراف ہے - صاف تسلیم کیا ہے اِس
میں جو کمی رہی ہے - اس پر نقطہ چینی کی ہے - یہاں رشی دیانند اور
حضرت محمد ایک کشتی کے مسافر ہیں - آپ اور کفار عرب دوسری
کشتی کے - رشی دیانند کو ہرج نہیں - آپ بھی اس کشتی میں آجائیں -
قرآن شریف کی تنقید میں رشی دیانند نے علاوہ دیباچہ کے
جس پر مولانا نے کسی باعث اپنا حق شفہ سمجھ لیا ہے - ۱۵۹ فقرے
(پیراگراف) لکھے ہیں - اس ساری تحریر میں مولانا ثناء اللہ صاحب
فقط نو مقامات ایسے ظاہر کر سکے ہیں - جہاں ان کی رائے میں ترجمہ
درست نہیں ہوا - یا آگے پیچھے کی عبارت سے بے تعلق ہو گیا
ہے - ان میں سے حضرت ابراہیم کے لئے تعظیماً صیغہ جمع استعمال
ہونے پر تو جناب مولانا خواہ مخواہ گرم ہوئے ہیں - اور سورہ حج میں
لفظ بیتی حضرت کی نظر تعمق اثر سے چُوک گیا ہے - سورہ احزاب
میں دوگنے عذاب کی بات بھی خواہ مخواہ جہنمیوں کے منہ میں ڈالی ہے
بھلا دوزخی اور ان کے منہ میں قرآن! تاہم ہم نے مولانا کی خاطر سے
اہل جہنم کو قرأت قرآن کا حصہ دار ہو لینے دیا ہے - ایک جگہ قرآن کی
عبارت کا کچھ مطلب نہیں بنتا - رشی نے یا اُن کے مقرر کئے مترجموں نے
مطلب بنا دیا ہے - ایک دو آیات میں عربی کے بے ربط محاورہ نے
ابتدائی مترجم کی عبارت کو چیستاں بنا دیا ہے - تاہم ہماری شرافت
دیکھو - ایسے تمام مقامات پر حضرت مولانا کا ارشاد بے حیل و حجت
منظور کر لیا ہے - آیات کا ترجمہ کچھ کر لیں - اعتراضات میں کوئی نقص
واقع نہیں ہوتا - یہ اور بات ہے - کہ ستیارتھ پرکاش کے مطالعہ

سے آپ کا مذہب ہی بدل گیا ہو۔ ہمیں حق پرکاش میں اس کے کچھ آثار نظر آئے ہیں۔ چنانچہ جیسا ہم نے اوپر عرض کیا خونخوار جانوروں کی حرمت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے۔

ایسا ہی سُور بھی مضر صحت ہے۔ خصوصاً گرم ملکوں میں۔

ہمیں پھر پھر حیرت ہوئی ہے۔ کہ یہ گرم ملکوں کی تخصیص کیوں کی ہے؟ جب مضر صحت گرم ملکوں میں ہے۔ تو حرام بھی بالخصوص گرم ملکوں ہیں ہوگا۔ اللہ ایمان سلامت رکھے!

قرآن نئی روشنی میں

یا

چودھویں کا چاند

رشی دیانند کا مقصد مذاہب کی تنقید سے یہ تھا۔ کہ تمام مذاہب کے پیرو اس تنقید کی روشنی میں اپنے عقائد پر غائر نظر ڈالیں۔ اور اوہام اور غیر معقول مسلمات سے اپنے سینہ بے کینہ کو صاف کر کے ہدایت حقہ کو قبول کریں۔ ستیارتھ پرکاش کے تنقیدی بابوں سے تمام مذاہب نے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان مذاہب کی تعبیریں رشی کے اعتراضات کے بعد کچھ کی کچھ ہو گئی ہیں۔ فی الحال ہمیں اہل اسلام سے ہی کام ہے۔ رشی کے دلائل کا اثر ان کے حین حیات میں ہی نہایت دور رس ہو چلا تھا۔ سر سید احمد خاں جن پر جیتے جی اہل اسلام نے کفر کے فتوے لگائے۔ آج موجودہ قوم مسلمانان کے ایک سرکردہ مصلح سمجھے جاتے ہیں۔ وہ رشی کے مقربوں میں سے

تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اور ان کی پند و نصائح سے فیضیاب ہوا کرتے۔ رشی کے متعلق انہوں نے ایک دفعہ یہ رائے ظاہر کی تھی۔ کہ رشی ان برگزیدہ شخصیتوں میں سے ہیں۔ جن پر الہام الٰہی نازل ہوتا ہے۔ سر سید احمد مسلمان تھے۔ اور تادم آخر مسلمان رہے۔ لیکن وہ مروّجہ عقائد اسلام سے مطمئن نہ تھے۔ انہوں نے قرآن شریف کی ایک تفسیر لکھی ہے۔ اس کا مقابلہ دیگر تفاسیر سے کرو۔ صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا ستیارتھ پرکاش کے چودھویں سملاس کے اعتراضات سے قرآن کے مسلمات کو محفوظ کرنے کی کوشش ہے۔ قرآن کے عقائد وید کے عقائد کے مطابق بنانے کی سعی ہے۔ یہ تفسیر اس وقت نایاب سی ہو رہی ہے۔ ناظرین اس کے اقتباسات کو اصل کتاب سے ملا نہ سکیں گے۔ مگر مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں ایک مختصر سا خاکہ ان اصلاحات کا دیا ہے۔ جو سر سید نے قرآن کی مروجہ تفاسیر میں کیں۔ ہم اسی خاکے میں سے چند فقرات ناظرین کے پیش کئے دیتے ہیں۔ سر سید کی تفسیر کے کچھ کچھ نتائج یہ ہیں۔

(۷) شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے۔ اس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے۔ بلکہ خود انسان میں جو نفس امارہ یا قوت بہیمیہ ہے۔ وہ مراد ہے۔

(۱۱) عہد عتیق و عہد جدید کی کتابوں میں تحریف لفظی واقع نہیں ہوئی مگر صرف تحریف معنوی ہوئی ہے۔ ۔۔ ۔۔

(۱۵) قرآن کی کسی آیت سے جبر پر اور کسی سے قدر پر استدلال کرنا۔ ۔۔ ۔۔ مقصد شارع کے برخلاف ہے۔ ۔۔ ۔۔

(۱۶) معراج اور شق صدر دونو رویا میں واقع ہوئے ہیں ۔ نہ کہ بیداری میں ۔۔ ۔

(۱۷) ۔۔ ۔۔ ۔۔ ملائک یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں ۔ اُن سے یہ مراد نہیں ہے ۔ کہ وہ کوئی جدا مخلوق انسان سے بالا تر ہے ۔ بلکہ خدا تعالےٰ نے جو مختلف قوتیں اپنی قدرت کاملہ سے مادہ میں ودیعت کی ہیں ۔ جیسے پہاڑوں کی صلابت ۔ پانی کا سیلان ۔ درختوں کا نمو ۔ برق کی قوت ۔ جذب و دفع و امثال ذالک ۔ انہیں کو ملائک و ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔

(۱۸) آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصّہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے ۔ یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں ۔ بلکہ یہ ایک تمثیل ہے ۔

(۱۹) معجزہ دلیل نبوت نہیں

(۲۰) قرآن میں آنحضرت صلعم سے کسی معجزہ کے صادر ہونے کا ذکر نہیں ہے ۔

(۲۶) شہدا کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے ۔ کہ ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں ۔ اس سے اُن کا علو درجات اور روحانی خوشی اور دُنیا میں مثال قابل تقلید چھوڑنا مراد ہے ۔ نہ یہ کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں ۔ اور مثل زندوں کے کھاتے پیتے ہیں

(۲۷) صُور کا لفظ جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے ۔۔ ۔۔ محض استعارہ ہے ۔۔ ۔۔

(۲۸) خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسما و افعال کے متعلق جو کچھ قرآن اور حدیثوں میں بیان ہوا ہے ۔ وہ سب بطریق مجاز و

استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا ہے۔ اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے۔ جیسے بعث و نشر۔ حساب و کتاب ۔ میزان۔ صراط۔ جنت ۔ دوزخ ۔ وغیرہ وغیرہ وہ بھی مجاز پر محمول ہے نہ کہ حقیقت پر۔

(۲۹) قرآن میں جو زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے۔ اس سے کسی واقعے کی خبر دینی مقصود نہیں ہے ۔ بلکہ صرف یہودیوں کے اس اعتقاد کی تردید مقصود ہے ۔۔ " "

(۳۰) قرآن میں جو جا بجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بداخلاقیاں پھیل جانے کے بعد ان پر طرح طرح کے عذاب کا نازل ہونا۔ اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے ۔کسی کو زلزلہ سے ۔کسی کو ٹڈیوں اور دیگر حشرات کے مسلط کرنے سے ۔۔ ۔۔ ۔۔ برباد کرنا بیان ہوا ہے ۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے ۔کہ درحقیقت ان کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے ۔بلکہ ابتدائے آفرینش سے یہ خیال تمام قوموں میں چلا آتا تھا ۔کہ جو ہولناک حادثے دُنیا میں واقع ہوتے ہیں ۔ وہ انسان کے گناہوں کی کثرت کے سبب واقع ہوتے ہیں ۔ اور انبیا کا کام یہ ہے کہ جن خیالات پر لوگ مجبول ہوئے ہیں ۔ اگر وہ خیالات مقاصد نبوت کے منافی نہیں ہیں ۔بلکہ ان کی تائید کرنے والے ہیں ۔تو وہ ان خیالات کی صحت یا غلطی سے کچھ تعرض نہیں کرتے ۔ بلکہ انہی خیالات کے موافق ان سے خطاب کرتے ہیں ۔

(۳۱) خدا کا دیدار کیا دنیا میں اور کیا عقبے میں نہ ان ظاہری آنکھوں سے ممکن ہے اور نہ دل کی آنکھوں سے ۔

(۳۲) قرآن مجید میں جو جنگ بدر و حنین کے بیان میں فرشتوں ..

کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے ان لڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا ہے۔

(۳۴) حضرت عیسی کا بن باپ کے پیدا ہونا قرآن کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔

(۳۵) کوئی امر عادت الٰہی یا قانون طبعی کے خلاف کبھی وقوع میں نہیں آتا۔

(۳۶) .. .. یہ مراد نہیں ہے۔ کہ ایسا (قرآن جیسا) فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے .. .. ..

(۳۸) قرآن سے جنات کا ایسا وجود کہ وہ ہوائی آگ کے شعلہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں۔ .. .. وغیرہ وغیرہ ثابت نہیں ہوتا۔

(۳۹) انبیا بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کے قصے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ ان میں جس قدر باتیں بظاہر قانون فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں۔ وہ سب درحقیقت ان کے مطابق بیان کی گئی ہیں .. ..

ناظر! دیکھ۔ یہ ہے رشی کی صحبت بابرکت کا اثر۔ اس اسلام اور عام مروج اسلام کا مقابلہ کر۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔

یہی حالت مولانا محمد علی کے ترجمہ قرآن کی ہے۔ آپ آدم کو ایک فرد نہیں۔ نوع مانتے ہیں۔ فرشتے اور شیطان کو طاقتیں۔ زمین و آسمان کی پیدائش کے چھ دنوں کو چھ منزلیں۔ حور و غلمان کو روحانی برکات۔ شق قمر کو اہل عرب کی طاقت کا زوال۔ قیامت کے روز چاند اور سورج

کے مجتمع ہونے کو اہل عرب اور اہل ایران کی سلطنتوں کا تنزل - باغ بہشت کو عراق و عرب - اور فارس کے باغ - حوروں کو کہیں کہیں اعلیٰ نسل کی عورتیں جن سے مسلمان فاتحوں کے نکاح ہوئے - دوزخ کو گنہگار کے دل کی حالت وغیرہ وغیرہ -

سرسید نے نسبتاً زیادہ شجاعت سے روایتی اسلام سے اپنے عقیدے کا تعلق منقطع کر لیا - اور اکثر وہ باتیں مانیں - جو رشی کے استدلال نے معقول قرار دیں - مولانا محمد علی کی تفسیر قرآن دیکھنے سے بھی یہ تو صاف صاف پتہ چلتا ہے - کہ تفسیر لکھتے وقت ان حضرت کے مدنظر بھی ستیارتھ پرکاش کا چودھواں باب ضرور تھا - مگر ادھر قادیانی سلسلہ سے بھی تو دینی علاقہ ہے آپ نے اس علاقے کا بھی کچھ حق ادا کیا - مثلاً معجزہ اسی قدر تسلیم کیا جتنا مجدد صاحب قادیانی سے منسوب کیا جاتا ہے یعنی پیش گوئی - آپ نے منجملہ دیگر معانی کے دوزخ اور بہشت کے وعدوں کو حضرت محمد کی پیشین گوئیاں بھی بنا دیا - کہ ان سے وہ دنیوی نعمتیں مراد تھیں - جو اسلام کی اشاعت کے بعد مسلمان فاتحوں کو مفتوح ممالک میں دستیاب ہوئیں ستیارتھ پرکاش کی تعلیمات کی صداقت کے آگے بھی سر تسلیم خم کیا - اور چپکے چپکے ویدک عقائد کو قرآنی مقولات میں جگہ دینے کی ایک بات آپ نے نہایت خوب کی - وہ یہ کہ لونڈیاں (مزنیہ) رکھنا قرآن کی رُو سے ناجائز قرار دے دیا - قرآن کی تعلیمات میں اس تجلسی اصلاح کا سہرا مولانا کے سر ہے - اگرچہ حقیقت شناس آنکھیں یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتیں - کہ یہ سہرا مولانا کے سر رشی کی بے لاگ تنقید کے مبارک ہاتھوں نے ہی بندھوایا ہے -
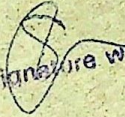
ممکن ہے - کوئی صاحب ہم سے پوچھ بیٹھیں - کہ کیا ان تاویلات کا حامل

درحقیقت قرآن کا اپنا متن ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں عرض یہ ہے۔ کہ کئی طبیعتوں کا میلان بہ نسبت عقل کے نقل کی پیروی کی طرف زیادہ ہوتا ہے وہ معقول بات کو بھی تسلیم اس وقت کرتی ہیں۔ کہ ان کے روایتی عقیدہ میں اسے شامل کردو۔ سرسید احمد اور مولانا محمد علی نے رشی کی اکثر تعلیمات قبول فرمائی ہیں۔ لیکن انہیں نام قرآنی عقائد کا دیا ہے۔ ممکن ہے۔ ان حضرات کے ارادے سے یہ خواہش خارج ہو۔ لیکن اس بات میں شک نہیں۔ کہ واقع میں یہ تدبیر عوام میں اصلاح کی اشاعت کے کام کو آسان بنا دیتی ہے۔ ان سے پیشتر کسی مفسر کو یہ تاویلات کیوں نہ سوجھیں؟ یہ سوال ان مصلحان اسلام کے حیطۂ غور سے باہر ہے۔ کچھ ہو۔ ہمیں خوشی ہے۔ کہ ویدک تلقینات کے قائل فقط اہل قرآن ہی نہیں ہو رہے۔ خود قرآن مجید ان حضرات کے ساتھ ساتھ رشی کا ہمنوا بن رہا ہے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ ان تفاسیر کے بعد پھر یہ سوال کیا جائے۔ کہ پرانی اقوام کے مروجہ قصّوں کو ان کی اوہام سے پُر صورت میں قرآن میں داخل کرنے سے کیا اس وہم کو برقرار نہیں رکھا گیا؟ اور کیا مسلمان فاتحوں کی عارضی کامیابیوں کا ذکر کر دینے سے قرآن ایک عارضی فالنامہ نہیں بن گیا؟

مولانا حالی فرماتے ہیں۔

> جو لوگ سرسید کی نسبت کہتے ہیں کہ جو معنی قرآن کے اُنھوں نے لکھے ہیں۔ وہ نہ خدا کو سوجھے۔ نہ رسول کو۔ سو شاید سرسید کی بعض تاویلات کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو۔ مگر ان کی تمام تفسیر کی نسبت ایسا کہنا ستم ظریفی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
>
> قرآن مجید میں باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس

ے رکر
وتاہے
عقیدہ
علیمات
ضرات
قع میں
سے
اسلام
کے
ساتھ
عد پھر
ے پڑہ
رکھا
قرآن